یکم اکتوبر ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۱۹

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

اَمن کا نوبیل انعام، اَندرونی کہانی

Tom Loftus

امن کے نوبیل انعام کے حوالے سے تنازعات اکثر سَر اٹھاتے رہتے ہیں۔ طبعیات، کیمیا اور حیاتیات کے شعبوں میں دیے جانے والے نوبیل انعام کے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں کم ہی کی جاتی ہیں۔ تحقیق کے میدان میں تنازعات کم ہی اُبھرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ دنیا بھر میں جتنی بھی تحقیق کی جارہی ہے، اُس میں معاملات کی شفّافیت کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اور پھر نتائج خود ثابت کرتے ہیں کہ کون سی تحقیق اعلیٰ اور حقیقی ہے۔

اگر آپ ناروے میں امریکا کے سفیر ہوں (جیسا کہ میں ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۸ء تک تھا) تو آپ کو ہر سال اکتوبر میں اپنے اِن باکس میں کئی ای میل ایسی ملیں گی، جن میں امن کے نوبیل انعام کے حوالے سے لابنگ اور سیاست کی کہانیاں بیان کی گئی ہوں گی۔ نوبیل کمیٹی کی طرف سے امن کے نوبیل انعام کے اعلان کے بعد اِن باکس میں ٹریفک بڑھ جاتی ہے۔ دنیا بھر سے لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں یعنی امن کے نوبیل انعام کے پسِ پردہ کارفرما سیاست کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔

۱۹۰۱ء سے اب تک چار امریکی صدور کو امن کا نوبیل انعام دیا جاچکا ہے۔ پہلی بار امن کا نوبیل انعام ۱۹۰۶ء میں تھیوڈور روزویلٹ کو دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں یہ انعام وُڈرو وِلسن نے پایا۔ ۲۰۰۲ء میں سابق امریکی صدر جمی کارٹر اور ۲۰۰۹ء میں براک اوباما کو امن کا نوبیل انعام دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ امن کا نوبیل انعام کس بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ عالمی امن کے لیے انجام دی جانے والی خدمات کی جانچ کا پیمانہ کیا ہے۔

تھیوڈور روزویلٹ کو روس اور جاپان کی جنگ ختم کرانے کے صِلے کے طور پر امن کا نوبیل انعام دیا گیا تھا۔ یہ جنگ وسیع تر اثرات کی حامل تھی اور اگر بروقت ختم نہ کرائی جاتی تو عالمی امن کے لیے شدید خطرات پیدا ہو سکتے تھے۔ روس بھی تب کمزور نہیں تھا اور جاپان بھی اچھا خاصا طاقتور تھا۔ امن کا یہ نوبیل انعام اُس وقت دیا گیا جب فریقین نے جامع امن معاہدے پر دستخط کر دیے۔ تھیوڈور روزویلٹ نے امن کا نوبیل انعام حاصل کرتے وقت اپنے خطاب میں کہا تھا کہ دنیا کے معاملات بہت پیچیدہ ہو چکے ہیں۔ اب لازم ہو چکا ہے کہ تمام اقوامِ عالم کے درمیان پائے جانے والے تنازعات کے مؤثر اور جامع حل کے لیے ایک عالمی ادارہ بنایا جائے۔ اِس ادارے کا، روزویلٹ کے خیال میں، بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو یعنی دنیا بھر کے ممالک جنگ پسندی کی ذہنیت ترک کر کے معاملات کو پُرامن طریقے سے طے کرنے کا میکینزم اپنائیں۔

وُڈرو وِلسن کو امن کا نوبیل انعام پہلی عالمی جنگ ختم کرانے اور اقوامِ متحدہ کی پیشرَو لیگ آف نیشنز کے قیام کی راہ ہموار کرنے سے متعلق خدمات کے صِلے کے طور پر دیا گیا۔ اس تنظیم کا خواب، جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں، تھیوڈور روزویلٹ نے دیکھا تھا۔ وُڈرو وِلسن نے اقوامِ متحدہ کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے غیر معمولی نوعیت کی خدمات انجام دیں۔ اُس وقت ایسے عالمگیر میکینزم کی ضرورت بھی تھی جس کے دَم سے جنگ کی راہ مسدود کرنا آسان ہو۔ بعد میں یہ ثابت ہوا کہ لیگ آف نیشنز دوسری عالمی جنگ کی راہ روکنے میں ناکام رہی اور دنیا کو ایک بار پھر قتل و غارت اور بربادی کی بھٹّی میں جھونک دیا گیا۔

جس وقت جمی کارٹر کو امن کا نوبیل انعام دیا گیا تب وہ امریکا کے صدر نہیں تھے۔ اُنہیں یہ انعام کسی ایک کارنامے یا مخصوص کارکردگی کی بنیاد پر نہیں دیا گیا۔ جمی کارٹر نے کم و بیش دو عشروں تک عالمی امن، بنیادی حقوق اور لبرل جمہوریت کے حوالے سے جو خدمات انجام دی تھیں، اُن کے اعتراف کے طور پر یہ انعام اُنہیں دیا گیا۔ جمی کارٹر نے پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں معاشی اور معاشرتی بہبود کے حوالے سے خاصا کام کیا تھا۔

اوباما کا تنازع

براک اوباما کو امن کا نوبیل انعام دیے جانے پر ایک دنیا کو حیرت ہوئی تھی۔ ہونی ہی چاہیے تھی۔ براک اوباما نے ۲۰۰۸ء میں امریکی صدر کا منصب سنبھالا تھا اور اگلے ہی

اندرونی صفحات پر

- غزہ جنگ کے دو سال اور ٹرمپ فارمولہ
- غزہ جغرافیہ نہیں، ایک چیخ ہے!
- سائبر سکیورٹی کا دردِ سر
- ہوشیار، ایک کلک آپ کے وجود کے لیے خطرہ!
- مغربی کنارے کی دو حصوں میں تقسیم کا منصوبہ
- جنگی جُنون کی گرم بازاری
- بھارت میں سیلاب سے تباہی
- بجٹ خسارے کی کہانی

سال اُنہیں امن کا نوبیل انعام دے دیا گیا۔ لوگوں نے سوچا تھا کہ اِتنی کم مدت میں اُنہوں نے ایسی کون سی خدمات انجام دے دیں جن کی بنیاد پر انہیں امن کے نوبیل انعام سے نواز دیا گیا۔ براک اوباما کو امن کا نوبیل انعام جوہری عدم پھیلاؤ اور ہمہ جہت جمہوریت کو فروغ دینے کے حوالے سے دیا گیا تھا۔ بہرحال، امن کا یہ نوبیل انعام انتہائی متنازع فیہ ثابت ہوا۔

براک اوباما نے تب کے روسی ہم منصب دمتری میدویدیف سے مذاکرات کے نتیجے میں اسٹریٹیجک (جوہری) ہتھیاروں میں تخفیف سے متعلق معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ روس کے موجودہ صدر ولادیمیر پیوٹن اُس وقت روس کے وزیرِاعظم تھے۔ یہ معاہدہ ۵ فروری ۲۰۲۶ء کو ختم ہوگا۔

جس وقت امن کا نوبیل انعام براک اوباما کو دیا گیا تب نوبیل انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر گیئر لینڈ سٹیڈ تھے۔ آں جہانی لینڈ سٹیڈ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۱۴ء تک نوبیل انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گیئر لینڈ سٹیڈ نے براک اوباما کو امن کا نوبیل انعام دیے جانے پر پچھتاوے کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے ناروے کی لیبر پارٹی سے تعلق رکھنے والے سابق وزیرِاعظم تھاربجون جیگلینڈ کو نوبیل کمیٹی میں تعینات کیے جانے پر اعتراض کیا تھا کیونکہ اُن کے خیال میں ایسا کرنے سے کمیٹی کی خودمختار حیثیت متاثر ہوئی تھی۔ براک اوباما کو امن کا نوبیل انعام دیے جانے کے وقت یعنی ۲۰۰۹ء میں جیگلینڈ نوبیل کمیٹی کے چیئرمین تھے۔

امن کے نوبیل انعام کا ''ناغہ''

امن کا نوبیل انعام ہر دور میں متنازع رہا ہے۔ ان انعام کے حقدار کا تعین کرنے کے حوالے سے لابنگ اور سیاست کی شکایات عام رہی ہیں۔ نوبیل کمیٹی کو اس حوالے سے بارہا شش و پنج کا سامنا رہا ہے۔ فطری علوم وفنون اور ادب کے مقابلے میں امن کے نوبیل انعام کا تعین بہت مشکل ثابت ہوتا رہا ہے کیونکہ اِس حوالے سے بہت بڑی تعداد میں اُمیدوار سامنے آتے رہے ہیں۔

اب تک ۱۹ سال ایسے رہے ہیں جب امن کا نوبیل انعام نہیں دیا گیا۔ دونوں عالمی جنگوں کے دوران بھی یہ انعام نہیں دیا گیا تھا۔ امن کے نوبیل انعام کے متازع فیہ ثابت ہوتے رہنے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ طاقتور ممالک دباؤ ڈال کر اپنی شخصیات کو یہ انعام دلواتے رہے ہیں۔ ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ امن کا نوبیل انعام کسی زندہ شخصیت کو دیا جاسکتا ہے۔

اوسلو ہی میں کیوں؟

سوئیڈن سے تعلق رکھنے والے ہتھیاروں کے تاجر اور ڈائنامائٹ کے موجد الفریڈ نوبیل نے جو دولت چھوڑی تھی، اُس سے ایک نوبیل انعام قائم کیا تھا تاکہ ہر سال فطری علوم و فنون، ادب اور امن سے متعلق خدمات انجام دینے والوں کی عزت افزائی ہو۔ الفریڈ نوبیل کا انتقال ۱۸۹۶ء میں ہوا تھا۔ نوبیل انعامات اسٹاک ہوم (سوئیڈن) میں دیے جاتے ہیں۔ امن کا نوبیل انعام ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں دیے جاتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ الفریڈ نوبیل کے خیال میں سوئیڈن کے مقابلے میں ناروے زیادہ پُرامن اور امن پسند ملک ہے۔

کون کون ہوتا ہے کمیٹی میں؟

نوبیل انعام کے حقدار کا تعین پانچ رکنی نوبیل پیس پرائز کمیٹی کرتی ہے۔ کمیٹی کے ارکان کا تعلق ناروے کی پارلیمنٹ میں نمائندگی رکھنے والے سیاسی جماعتوں سے ہوتا ہے تاہم وہ پارلیمنٹ کے رکن نہیں ہوسکتے۔ پارلیمنٹ کی سب سے بڑی جماعت سے دو ارکان لیے جاتے ہیں۔

نوبیل پیس پرائز کمیٹی کے ارکان تجربہ کار سیاست دان ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی سیاست ہی میں گزاری ہوتی ہے۔ اِن کا کیریئر شاندار ہونا چاہیے۔ عام طور پر اس کمیٹی میں ایسی شخصیات کو لیا جاتا ہے جن کی زندگی اور کارکردگی سے کوئی تنازع جُڑا ہوا نہ ہو۔

امن کے نوبیل انعام کے حقدار کا تعین کرنے کے سلسلے میں کسی بھی طرح کی حکومتی یا ریاستی مداخلت سختی سے ممنوع ہے۔ ناروے کی حکومت اس معاملے سے بالکل دور رہتی ہے۔ اگر کوئی اسکینڈل اُٹھ کھڑا ہو تو ایسا ہنگامہ برپا ہوتا ہے کہ حکومت کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

کون تجویز کرسکتا ہے؟

جو افراد اور تنظیمیں امن کے نوبیل انعام کے لیے نام تجویز کرسکتی ہیں، اُن کی باضابطہ فہرست موجود ہے۔ ہر سال سیکڑوں افراد اور تنظیموں کو اِس انعام کے لیے نامزد کیا جاتا ہے اور کسی بھی طرح کے تنازع سے بچنے کے لیے اُن کے نام پچاس سال بعد منظرِ عام پر لائے جاتے ہیں۔ ہر سال دنیا بھر میں اکتوبر کے مہینے میں سیاسی کھیل شروع ہوتا ہے جو امن کے نوبیل انعام کے حقدار کا تعین کرنے کے حوالے سے مداخلت پر مبنی ہوتا ہے، بالخصوص تب کہ جب انتخابات نزدیک ہوں۔ دنیا بھر سے تعلیمی اداروں کے سربراہوں، اعلیٰ علمی و ادبی شخصیات، ڈاکٹرز، سوشل ورکر، فلسفیوں، سماجی کارکنوں، امدادی اداروں کے سربراہوں، امدادی اداروں، پروفیسرز، امن سے متعلق اداروں کے سربراہوں، قانون دانوں اور مذہبی رہنماؤں کے نام امن کے نوبیل انعام کے لیے تجویز کیے جاتے ہیں۔

اِس سال کیا ہوگا؟

رواں سال امن کے نوبیل انعام کے تعیّن کا معاملہ بہت ٹیڑھا ہے۔ اب تک کوئی ایسا امیدوار سامنے نہیں آیا ہے جس کے بارے میں کمیٹی پورے یقین کے ساتھ درست فیصلہ کرسکے۔ کئی امیدوار میدان میں ہیں مگر کسی کی بھی کارکردگی ایسی نہیں کہ اُسے امن کے نوبیل انعام کا حقدار قرار دیا جائے اور ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ۲۰۲۵ء بیسواں ایسا سال ہو جب امن کا نوبیل انعام نہیں دیا گیا۔ رواں سال امن کا نوبیل انعام کیونکر دیا جاسکتا ہے جبکہ ہر طرف جوہری ہتھیاروں کے استعمال کا خوف پایا جاتا ہے؟ پاکستان اور بھارت کے درمیان غیر معمولی کشیدگی ہے۔ اسرائیل اور ایران بھی لڑ چکے ہیں۔ روس اور یوکرین کی جنگ جاری ہے۔ اس جنگ کے ختم ہونے کے آثار بھی نہیں۔ روس کے لیے اب یہ جنگ اَنا کا مسئلہ بن چکی ہے۔ بہت بڑے پیمانے پر نقصان سے دوچار ہونے کے بعد بھی روس پسپائی کے لیے تیار نہیں۔ مغربی دنیا یوکرین کے ساتھ ہے۔ وہ اُس کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہے تاکہ جنگ جاری رہ سکے۔

یورپ کے معاملات بھی اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔ ناروے میں رائے عامہ کے ایک حالیہ جائزے میں شرکا کی اکثریت نے کہا کہ اُنہیں بہت جلد یورپ میں ایک بہت بڑا تنازع ابھرتا دکھائی دے رہا ہے۔ اوسلو کے پیس ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناروے کے لوگ کسی بڑی جنگ کے خوف میں مبتلا ہیں۔

ناروے کے وزیرِاعظم نے کسی بڑے بحران اور جنگ کا سامنا کرنے کی تیاریوں سے متعلق وائٹ پیپر بھی جاری کیا ہے۔ اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اِس وقت یورپ میں کیا ہو رہا ہے اور مستقبل قریب میں کیا ہوسکتا ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Nobel peace prizes: The inside story".
("The Globalist". September 6, 2025)

غزہ جنگ کے دو سال اور ٹرمپ فارمولہ

افتخار گیلانی

فلسطین کے محصور خطّے غزہ پر اسرائیل کی مسلّط کردہ جنگ نے دو سال مکمل کر لیے ہیں۔ ۷۳۰ دِنوں میں دو لاکھ ٹن سے زائد دھماکا خیز مواد اس خطّہ پر برسایا گیا، جس سے ۷۷ ہزار سے زائد افراد ہلاک ہوئے ہیں۔

گو کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، اس چھوٹے سے خطّہ میں ہلاکتوں کی تعداد ۶۷ ہزار ہے، مگر چونکہ دس ہزار کے قریب افراد لاپتا بھی ہیں، بتایا جاتا ہے کہ اُن کی لاشیں عمارتوں کے ملبے کے نیچے دَبی ہوں گی۔

ان میں ۲۰ ہزار بچے اور ۱۲,۵۰۰ کے قریب خواتین ہیں۔ میڈیکل اسٹاف و صحافیوں کو بھی بخشا نہیں گیا۔ ۱۶۷۰ میڈیکل اسٹاف کے علاوہ ۲۴۵ صحافی بھی بمباری سے ہلاک ہوئے۔ نیز ۴۶۰ افراد جن میں ۱۵۴ بچے شامل ہیں، بھکمری کے شکار ہو گئے۔

اقوامِ متحدہ کے آفس فار کوآرڈی نیشن آف ہیومینٹرین افیئرز نے ۱۴ اگست تا ۲۳ ستمبر کے دوران سائٹ مینجمنٹ کلسٹر کے اعداد و شمار کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ۳,۸۸,۴۰۰ سے زائد فلسطینی بے دخل ہوئے جن میں اکثریت غزہ سٹی سے فرار ہونے والوں کی تھی۔ اسرائیلی فوج نے کئی بار غزہ کے مکینوں کو جنوب کی طرف منتقل ہونے کا حکم دیا۔

غزہ کے نیسیرات کے مغرب میں ایک پھٹے پھٹے خیمے میں عابیر علیوا اپنے دو بچوں کے درمیان بیٹھی ہے۔ عابیر نے اگست میں کیمپ میں پناہ لی تھی، وہ اپریل میں غزہ سٹی میں ایک اسرائیلی حملے میں اپنے شوہر کو کھو چکی ہے اور اب اپنے دو بچوں کی کفالت کے بوجھ تلے ہے۔

عابیر نے فون پر بتایا کہ جنگ کے آغاز پر وہ شجاعیہ محلّے سے وسطی غزہ کی طرف فرار ہوئی، پھر چند مہینوں بعد اپنے گھر واپس آئی۔ مگر پھر اس کو اپنے محلّے سے ہجرت کرنی پڑی۔ مگر اب وہ دوبارہ بے دخلی کا سامنا نہیں کر سکتی۔ اس سب کے باوجود عابیر ایک چھوٹی سی امید کے سہارے زندہ ہے۔

وہ کہتی ہے ''میں اُمید کرتی ہوں کہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اِس جنگ کو روکنے کے لیے قدم اٹھائیں گے۔ ہم مزید تباہی اور تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ میں صرف اپنے دو بچوں کے ساتھ امن سے جینا چاہتی ہوں''۔

دو برسوں کے بعد خوش آئند بات بس اتنی ہے کہ دو سال کے بعد جنگ میں پہلی مرتبہ اسرائیل اور حماس، دونوں ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئے ہیں جہاں ان کے لیے آپشن محدود ہوتے جا رہے ہیں۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے جو بیس نکاتی امن فارمولہ پیش کیا ہے، اس نے امیدیں تو جگا دی ہیں، مگر خدشات بھی پیدا کر دیے ہیں۔

سب سے پیچیدہ معاملات، اسرائیلی فوج کا مکمل انخلا، فلسطینی ریاست کا قیام اور مکمل طور پر غزہ کو غیر مسلح کرنا ہے۔ اسرائیل جو ۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے سے منہ موڑ سکتا ہے، تو کیا ضمانت ہے کہ حماس کی تحویل میں اسرائیلی قیدیوں کی رہائی کے بعد وہ مکمل انخلا سے انکار کر سکتا ہے۔ اسرائیل مرحلہ وار انخلا پر زور دے رہا ہے۔ مگر اس سے قبل اس کے سبھی قیدی رہا ہونے چاہئیں۔

اس سال ۱۹ جنوری کو جب اسرائیل اور حماس نے ۴۲ دن کی جنگ بندی اور قیدیوں کے تبادلے پر اتفاق کیا تھا، تو انہی دنوں حماس نے محصور خطّہ میں حکومت سے الگ ہونے اور انتظامیہ کو ایک عبوری نمائندہ فلسطینی قیادت کے حوالے کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔

اس جنگ بندی سے قبل چینی دارالحکومت بیجنگ میں حماس اور فلسطین لبریشن آرگنائزیشن کے ایک اہم دھڑے الفتح کے لیڈروں کے درمیان اتفاق رائے ہو گیا تھا۔

دونوں فریق بیجنگ سے ترکیہ کے دارالحکومت انقرہ آئے تھے اور طے ہوا تھا کہ اسرائیلی جیل میں قید الفتح کے ایک لیڈر مروان برغوثی فلسطین کے دونوں خطّوں مغربی کنارے اور غزہ کی مشترکہ قیادت سنبھالیں گے اور محمود عباس اور حماس کی لیڈر شپ مستعفی ہو جائے گی۔

حماس کی طرف سے رہائی کے لیے قیدیوں کی جو پہلی فہرست اسرائیل کو دی گئی تھی، اس میں مروان برغوثی کا نام پہلے نمبر پر تھا۔ اس دوران ان کی اہلیہ فدوا برغوثی انقرہ، استنبول اور دوحہ کے چکّر لگا رہی تھیں۔

ذرائع کے مطابق محمود عباس نے ہی اسرائیلوں کو باور کرایا کہ حماس کی شہ پر برغوثی کی رہائی فلسطینی اتھارٹی اور اسرائیل کے مفاد میں نہیں ہوگا، جس کے بعد ان کا نام رہا ہونے والے قیدیوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ وہ ۲۰۰۲ء سے اسرائیلی جیل میں طویل سزا بھگت رہے ہیں۔

لہٰذا اس وقت بھی حماس اقتدار سے الگ تو ہو سکتی ہے، مگر غیر مسلح ہونا اور اسرائیلی انخلا اور فلسطینی ریاست پر کسی پیشرفت کی عدم موجودگی کی وجہ سے معاملہ کھٹائی میں پڑ سکتا ہے۔

ویسے کسی بھی فریق کے لیے صدر ٹرمپ کی تجویز کو مکمل طور پر رد کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اسرائیلی قیدیوں کے اہل خانہ، جو طویل عرصے سے مایوس تھے، حالیہ پیشرفت کو ایک امید کی کرن کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح غزہ میں بھی عام لوگ ایک آس لگائے ہوئے ہیں۔

اگرچہ ٹرمپ کا منصوبہ فلسطینی اُمنگوں یا جنگ کے خاتمے کے لیے عرب دنیا کی وسیع تر امیدوں پر پورا نہیں اترتا، لیکن یہ ایک بنیاد ضرور فراہم کرتا ہے، جس پر تعمیر ممکن ہے۔ غزہ کے فلسطینی، جو شدید مصائب کا سامنا کر رہے ہیں، اس منصوبے میں کم از کم بمباری میں وقفے کی امید دیکھ رہے ہیں۔

فلسطین کی عرب امریکن یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کی ماہر پروفیسر ڈاکٹر سانیہ فیصل الحسینی کے مطابق ''کسی کو بھی ٹرمپ کی اس تجویز کو کسی 'بریک تھرو' کے طور پر نہیں لینا چاہیے۔ یہ نہ تو فلسطینی امیدوں پر پوری اترتی ہے اور نہ ہی تباہی کے اس دائرے کے خاتمے کی ضمانت دیتی ہے، مگر اس میں ایسے عناصر ضرور ہیں جنہیں آگے بڑھایا جا سکتا ہے''۔

ایک عمومی تاثر یہ بھی ہے کہ اب خود واشنگٹن کو بھی احساس ہو گیا ہے کہ جنگ ختم ہونی چاہیے۔ اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کے ساتھ واشنگٹن میں میٹنگ کے دوران ٹرمپ نے بتایا کہ اسرائیل پبلک ریلیشنز کے فرنٹ پر ناکام ہو گیا ہے اور وہ مزید سفارتی سطح پر اس کا دفاع کرنے سے قاصر ہے۔

اسی میٹنگ کے دوران انہوں نے نیتن یاہو کی قطری وزیراعظم محمد بن عبدالرحمٰن بن جاسم الثانی سے بات کروائی، جس میں اسرائیلی وزیراعظم نے دوحہ پر حملے کے لیے معذرت ظاہر کی۔ اس کے بعد ٹرمپ نے باضابطہ ایک حکم نامہ پر دستخط کیے، جس میں قطر کو سیکورٹی ضمانت دی گئی۔

ٹرمپ نے مطالبہ کیا کہ یرغمالیوں کو جلد از جلد ۷۲ گھنٹے کے اندر رہا کیا جائے، اس دوران اسرائیلی فوجی کارروائیاں معطل رہیں گی۔ مگر جنگ زدہ علاقوں میں جنگ بندی کی

نگرانی کون کرے گا؟ محفوظ گزرگاہ کی ضمانت کون دے گا؟

وضاحت نہ ہونے کی صورت میں معمولی خلاف ورزیاں پورے عمل کو سبوتاژ کرسکتی ہیں۔ حماس نے دہرایا کہ وہ 'غزہ کی انتظامیہ کو فلسطینی قومی اتفاق رائے پر مبنی ایک آزاد ادارے کے حوالے کرنے کی منظوری' دیتا ہے، جسے عرب اور اسلامی حلقوں کی حمایت حاصل ہو۔

ٹرمپ کے بتائے گئے بیرونی 'بورڈ آف پیس' میں بین الاقوامی شخصیات کے شامل ہونے کو حماس نے سختی سے مسترد کیا۔ حماس کے عہدیدار موسیٰ ابومرزوق نے سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کی ممکنہ نامزدگی خاص طور ان کے عراق جنگ میں کردار کی وجہ سے ناقابلِ قبول بتائی۔

تیسرا، ہتھیار ڈالنے کا معاملہ ہے۔ ٹرمپ کے ۲۰ نکاتی امن منصوبے میں حماس سمیت دیگر گروپوں کو عسکری طور پر غیر مسلح کرنے اور غزہ کی حکمرانی میں شرکت سے روکا جانا شامل ہے۔ نیتن یاہو اور اُن کے حامی چاہتے ہیں کہ حماس کی عسکری صلاحیت ختم کی جائے۔

مبصرین کے مطابق حماس کے لیے ہتھیار چھوڑ دینا بغیر سیاسی ضمانتوں کے محض سرینڈر کے مترادف ہوگا۔ خامیوں کے باوجود، ٹرمپ اور حماس کے بیانات نے سیاسی نقشہ تبدیل کردیا ہے۔ یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ یہ ایک تاریخی موڑ ہے۔ ماضی کی کوششیں عدم اعتماد، عدم توازن مطالبات کی چٹانوں پر ٹوٹ چکی ہیں۔ فلسطینی امن کی کوششیں منصوبے یا فنڈز کی کمی کی وجہ سے ناکام نہیں ہوتیں بلکہ اعتماد، معتبر نفاذ اور سیاسی ارادے کی کمی کی وجہ سے ناکام ہوتی ہیں۔

القدس پارلیمانی فورم کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر محمد مکرّم بلاوی کے مطابق خطے کا مسئلہ ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء سے شروع نہیں ہوا۔ مغربی میڈیا اب اسی دن کو جس دن حماس کے عسکری افراد نے اسرائیلی بستیوں پر حملہ کیا، جنگ کا نقطہ آغاز سمجھتے ہیں۔ صرف ۲۰۲۳ء کے پہلے نو ماہ میں ہی کم از کم ۲۳۰ فلسطینی ہلاک ہوئے تھے، جو ۲۰۰۵ء کے بعد سب سے زیادہ تعداد تھی۔ اسی سال کے پہلے نصف میں، کم از کم ۱۱۴۸ حملوں کی اطلاع ملی، جو اسرائیلی آبادکاروں نے فلسطینیوں پر کیے۔ انتہائی دائیں بازو کے گروہ، جو اَب نیتن یاہو کی حکومت کے ذریعے مین اسٹریم میں شامل ہو چکے ہیں، نے تقریباً تباہی کو دعوت دی تھی۔

اسرائیلی سفارت کار اپنے عرب ہمسایوں کے ساتھ کسی معاہدے کی توقع تو کر رہے تھے، مگر اس دوران فلسطین پر کسی بھی بات چیت کو مسترد کرتے تھے۔ تل ابیب کی قیادت میں غرور اور برتری کا احساس سرایت کر چکا تھا اور وہ فلسطین کو تنازع ماننے سے ہی انکاری تھے۔ جب نیتن یاہو نے جنرل اسمبلی میں 'گریٹر اسرائیل' کا نقشہ پیش کیا جس میں مغربی کنارے اور غزہ کو اسرائیل کے بحیرہ میں دکھایا گیا، تو صورتحال مزید پیچیدہ ہوگئی۔

تاریخی طور پر اسرائیل صرف اُسی وقت امن معاہدوں پر آمادہ ہوا ہے جب وہ دباؤ میں رہتا ہے۔

چند سال قبل نئی دہلی میں ڈیوڈ شلوموروزن، جو سابق چیف ریبائی برائے آئرلینڈ اور امریکن جیوش کمیٹی کے عہدیدار ہیں، نے اس کالم نگار کو بتایا کہ ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد کی مایوسی کی فضا نے ہی اسرائیل کو مصر کے ساتھ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیونکہ اس جنگ نے اسرائیلی برتری کے تصورات کو توڑ دیا تھا۔ ان کے بقول: 'ہمارے ناقابلِ شکست ہونے کا بھرم ٹوٹ گیا تھا۔ حالانکہ ہم نے جنگ جیتی تھی، مگر ہمیں لگا کہ ہم ہار گئے ہیں۔ اسی طرح مصریوں کو بھی ایک تلخ جیت کا احساس تھا۔' اسی طرح سابقہ تاریخی تناظر میں امن معاہدے طے پائے۔

حماس کے ساتھ جنگ نے بھی اسرائیل کی ناقابلِ شکست شبیہ کو جھنجوڑ دیا ہے۔ ٹرمپ کے پیش کردہ منصوبے نے اسرائیلی مذہبی قوم پرستوں اسمتر وچ اور بن گویر کو بھی دھچکا دیا، جو مغربی کنارے کی ضم کرنے اور غزہ کے دو ملین فلسطینیوں کے اخراج اور دوبارہ یہودی آبادکاری کا خواب دیکھ رہے تھے۔

ٹرمپ کے امن منصوبہ میں سابق برطانوی وزیراعظم کو کوئی رول دینا اس کو پیچیدہ بنا سکتا ہے۔ انہوں نے عراق کی جنگ میں برطانیہ کو شامل کیا اور غزہ میں عبوری انتظامیہ کے سربراہ کے طور پر ان کا نام آرہا ہے۔ غزہ انٹرنیشنل ٹرانزیشنل اتھارٹی (جی آئی ٹی اے) کے منصوبے میں ایک درجہ بندی دکھائی گئی ہے، جس میں بین الاقوامی ارب پتیوں اور کاروباری شخصیات کا ایک بورڈ ہوگا اور اس کے ماتحت 'غیر جانبدار' فلسطینی ناظمین ہوں گے۔

انتظامیہ اسرائیل، مصر اور امریکا کے ساتھ کام کرے گی۔ ایک دستاویز میں اس بورڈ کے ممکنہ امیدواروں کے طور پر چار نام درج ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی فلسطینی نہیں ہے۔ ایک نام سیگرڈ کاگ ہے، جو اقوامِ متحدہ کی مشرقِ وسطیٰ امن عمل کی خصوصی کوآرڈی نیٹر رہ چکی ہیں۔ دیگر نام 'عالمی سطح کے معروف افراد' کے طور پر بیان کیے گئے ہیں، ان میں مارک روان، نگیب سعویریس اور آری یہ لائٹ اسٹون شامل ہیں۔

اسٹون کا غزہ ہیومینیٹیرین فاؤنڈیشن (جی ایچ ایف) کے قیام اور پیشرفت میں اہم کردار رہا ہے۔

جی ایچ ایف کی سائٹس پر غزہ میں دو ہزار سے زائد افراد ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ وہ سابق امریکی سفیر ڈیوڈ فریڈمین کے سینئر مشیر رہ چکے ہیں جب فریڈمین صدر ٹرمپ کے پہلے دور میں اسرائیل میں امریکی سفیر تھے، اور اب وہ مشرقِ وسطیٰ ایجنڈا کے ایلچی اسٹیو وٹکوف کے قریبی ہیں۔

نگیب سعویریس تقریباً ۱۰/ارب ڈالر کے اثاثوں کے مالک مصر کے امیر خاندان سے ہیں۔ ان کا بلیئر کے ساتھ دیرینہ رابطہ ہے۔ بلیئر ان کے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے قاہرہ آئے تھے۔ انہوں نے افغانستان کی تعمیر نو میں شرکت بھی کی۔ مارک روان بلومبرگ کے مطابق ۲ء۱۰/ارب ڈالر کے قریب مالیت کے مالک ہیں۔ ۶۳ سالہ یہ یہودی امریکی ایپولو گلوبل مینجمنٹ کے سی ای او ہیں۔

روان یونیورسٹی آف پنسلوینیا کے وہارٹن بزنس اسکول کے بورڈ ممبر بھی ہیں اور ایک بڑے ڈونر ہیں۔ سیگرڈ کاگ ایک معروف یورپی ٹیکنوکریٹ جو ۲۰۲۳ء کے اواخر سے ۲۰۲۵ء کے وسط تک اقوام متحدہ کی غزہ کے لیے اعلیٰ انسانی امداد اور تعمیر نو کوآرڈی نیٹر رہ چکی ہیں۔ وہ پہلے بیروت، دمشق اور یروشلم میں اقوامِ متحدہ کی نمائندہ رہ چکی ہیں اور ہالینڈ کی ایک لبرل جماعت کی سیاست سے وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر مکرّم کے مطابق، تکبّر اور استعماری رویہ ۷/اکتوبر کے واقعات کی براہِ راست وجہ بنا۔ دہائیوں کی جدوجہد، ناکام مذاکرات، اور جھوٹے وعدوں کے بعد فلسطینیوں کو یقین ہو چلا تھا کہ ان کو جائز حقوق سے دور کر دیا گیا ہے۔ 'طوفان الاقصیٰ آپریشن' اسی سیاسی جمود کے ردِعمل کے طور پر سامنے آیا۔

گزشتہ دو برسوں کے دوران غزہ پر جاری قتلِ عام نے جدید تاریخ میں انسانی تباہی کی ایسی مثال قائم کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ہزاروں بچوں کی شہادت، براہِ راست نشر ہونے والے قتلِ عام، دنیا بھر میں سب سے زیادہ معذور بچوں کی تعداد، اور اتنے صحافیوں کی ہلاکت کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم سمیت تمام جنگوں کا مجموعہ بھی اس کے برابر نہیں آتا۔

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسرائیل اب خود ایک علاقائی اور عالمی بحران بن چکا ہے۔ یہ جنگ فلسطینی مسئلے کو ختم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کے برعکس، اس نے اسرائیل کو دنیا

میں پہلے سے زیادہ تنہا کر دیا، اس کی داخلی اور خارجی ساکھ کو مجروح کیا، اور اس کی معیشت و پالیسیوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ اسرائیل اپنے اہداف نہ عسکری طور پر حاصل کر سکا، نہ سیاسی طور پر۔ وہ صرف عام شہریوں کے قتل اور غزہ کی تباہی تک محدود رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اقوامِ متحدہ، عالمی عدالتوں اور سلامتی کونسل پر دنیا کا اعتماد متزلزل ہوگیا۔

امریکا میں بھی اب آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ وہ کب تک اسرائیل کا بوجھ اٹھاتے رہیں گے۔ اسرائیل کو ہر سال امریکا سے تقریباً ۸ء۳/ارب ڈالر ملتے ہیں جن میں ۳ء۳/ارب ڈالر ملٹری اور ۵۰۰ ملین ڈالر میزائلوں کے لیے ملتے ہیں۔ یہ امداد اسرائیل کے کل دفاعی بجٹ کا تقریباً ۱۵ تا ۲۰ فیصد بنتی ہے۔ اسرائیل کا کُل دفاعی بجٹ تقریباً ۲۴/ارب ڈالر ہے، جبکہ اس کا مجموعی قومی بجٹ ۱۶۰ تا ۱۷۰/ارب ڈالر کے درمیان ہے۔ اسرائیل کی جی ڈی پی تقریباً ۵۵۰/ارب ڈالر ہے لیکن اس کے بجٹ کا ایک بڑا حصہ دفاع پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر امریکا امداد بند کر دے تو اچانک ۸ء۳/ارب ڈالر کی کمی سے اسرائیل کے دفاعی بجٹ میں تقریباً ۱۶/فیصد کمی آئے گی۔ اسرائیل کو یا تو اپنے عوام پر ٹیکس بڑھانا پڑے گا یا تعلیم، صحت اور فلاحی اسکیموں میں کٹوتی کرنا ہوگی۔ ایک تخمینے کے مطابق اسرائیل کو یہ خسارہ پورا کرنے کے لیے تقریباً ۵ء۱/فیصد جی ڈی پی اضافی محصولات پیدا کرنا ہوں گے۔ یہ ممکن تو ہے، مگر عام شہریوں پر مہنگائی اور بجٹ کا دباؤ بڑھ جائے گا۔ اسرائیل کو امریکی ساختہ ہتھیاروں، جیسے ایف۔۳۵ طیارے، اپاچی ہیلی کاپٹر، آئرن ڈوم میزائل اور امریکی پرزوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

امداد بند ہونے کے بعد، اسے نئے سودوں کے لیے خود ادائیگی کرنی پڑے گی۔ امریکی امداد صرف پیسوں کی بات نہیں، بلکہ یہ ایک سیاسی ضمانت ہے۔

دنیا بھر میں اسرائیل کے لیے امریکی حمایت اقوامِ متحدہ، یورپی یونین اور نیٹو جیسے فورمز پر ایک ڈھال کا کردار ادا کرتی ہے۔ امداد بند ہونے کا مطلب صرف عسکری خلا نہیں بلکہ سیاسی تنہائی بھی ہوسکتا ہے۔ اسرائیلی عوام اور قیادت کے لیے امریکی تعلقات ایک سلامتی کا ستون ہیں۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۸/اکتوبر ۲۰۲۵ء)

غزہ جُغرافیہ نہیں، ایک چیخ ہے!

افتخار گیلانی

قاہرہ سے فلسطین کی غزہ سرحد یعنی رفح کراسنگ تک کا فاصلہ چار سو کلومیٹر ہے۔ پانچ سے چھ گھنٹے کی مسافت، لیکن یوں لگتا ہے جیسے دو مختلف دنیاؤں کا سفر ہو۔ قاہرہ دریائے نیل، اس کے پلوں اور اہرام کی جھلکیوں کے ساتھ ایسی تہذیب کی یاد دلاتا ہے جو ہزاروں برسوں سے قائم ہے۔ جوں جوں سفر مشرق کی طرف بڑھتا ہے اور گاڑی سینائی کے صحرا میں داخل ہوتی ہے، منظر نامہ ویران اور درشت ہو جاتا ہے۔ چار گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد العریش شہر کی فلک بوس عمارتیں نظر آتی ہیں، جو سینائی کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں سڑک بحیرہ روم کی طرف مڑتی ہے اور غزہ کے بحران کا ابتدائی چہرہ سامنے آتا ہے۔ یہاں افق کو پہاڑ یا سمندر نہیں، بلکہ امدادی ٹرکوں کی قطاریں روک لیتی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں حدِ نگاہ تک تقریباً ۴۴ کلومیٹر لمبی ٹرکوں کی قطار ہے، جن میں آٹا، چاول، دالیں، پھلیاں، بوتلوں میں پانی اور دوائیں، یعنی وہ سب کچھ موجود ہے جو بھوک سے تڑپتی قوم کو درکار ہے۔ ڈرائیور اپنے کیبنوں کے پاس مٹی کے تیل کے چولھوں پر بغیر دودھ کی چائے بنا رہے ہیں۔ کچھ اپنے ٹرکوں کے نیچے لٹکے جھولوں میں سو رہے ہیں۔ ان کے ٹرکوں میں زندگی ہے، مگر زندگی بھوک سے بے حال زندہ لوگوں کی طرف نہیں بڑھ رہی، وہ ساکت ہے۔

قدرت کی ستم ظریفی عیاں ہے۔ رفح کراسنگ کے ایک طرف وافر غذائی اجناس ہیں، دوسری طرف بس چند میٹر کے فاصلے پر بھوک ہے۔ اسرائیلی ٹینک صاف نظر آ رہے ہیں۔ دور غزہ کے رفح قصبے کی کھڑکیوں اور چھتوں پر کھڑے بچوں اور بڑوں کے سوکھے ہوئے ڈھانچے نظر آ رہے ہیں، جنہوں نے شاید کئی ہفتوں سے نوالہ نہیں دیکھا۔ ایسا لگ رہا ہے کہ پکی ہوئی خوراک کی خوشبو سرحد پار پہنچ رہی ہے، مگر محصور لوگوں کے لیے اس کی اشتہا انگیز خوشبو اذیت سے کم نہیں۔ ان کی بقا کا دارومدار خوراک کی خوشبو سونگھنے پر رہ گیا ہے جس کو وہ چھو نہیں سکتے، بس سونگھ سکتے ہیں۔ دنیا بھر سے شخصیات غزہ کے محصور باسیوں کے ساتھ یکجہتی کے لیے آتی ہیں، لیکن رفح کراسنگ سے واپس چلی جاتی ہیں۔

ترکیہ کی حکمراں جماعت آق پارٹی کے حقوقِ انسانی شعبہ کے نائب چیئرمین حسن بصری یالچن کی قیادت میں ۳۰ رکنی پارلیمانی وفد رفح کراسنگ پر اظہارِ یکجہتی کرنے آیا۔ وہ وعدہ کر رہے ہیں کہ واپس آئیں گے اور رکاوٹیں پھلانگ کر غزہ کے اندر جائیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ حالیہ قطر پر حملہ کرنے سے اسرائیل نے ساتویں ملک پر بھی ہلہ بول دیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے: ''اسرائیل کا سانپ ایک ایک کر کے ہم سب کو ڈس رہا ہے اور ہم بس اپنی باریوں کا انتظار کر رہے ہیں۔'' غزہ کے اندر قحط جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ ڈھائی ملین کی آبادی کا ایک تہائی حصہ بھوک سے مرنے کے انتظار میں ہے۔ بچے بھوکے پیٹ سوتے ہیں۔ والدین کئی دن کچھ نہیں کھاتے تاکہ بچے آدھی روٹی کھا سکیں۔ فلسطینی وزارتِ صحت کے مطابق ۴۲۵/افراد، جن میں ۱۳۰/بچے شامل ہیں، بھوک اور غذائی قلت سے مر چکے ہیں۔

فلسطین سے متعلق اقوام متحدہ کے ادارے کے سربراہ فلپ لزارینی کہتے ہیں کہ ان کی ٹیموں نے جن بچوں کو دیکھا وہ سب لاغر، کمزور اور موت کے قریب ہیں اور فوری علاج کے منتظر ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ کے فرنٹ لائن ہیلتھ ورکرز بھی بھوک کا شکار ہیں۔ وہ بسا اوقات کام کے دوران بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطابق فی الوقت ۶ ہزار امدادی ٹرک اردن اور مصر میں کھڑے ہیں، مگر اسرائیل کی ناکہ بندی کی وجہ سے غزہ نہیں پہنچ پا رہے۔ ایتھوپیا اور یمن کی طرح یہ قحط خشک سالی یا فصل کی ناکامی کا نتیجہ نہیں، بلکہ انسانی ہاتھوں کا تھوپا ہوا قحط ہے۔

مصر کے وزیرِ خارجہ بدر عبدالعاطی نے کہا: ''یہ انجینئرڈ بھوک ہے''۔ غزہ کے اندر النصر شہر کے رہائشی ابو رمضان بتاتے ہیں: ''بھوک ایسی ہے جیسے ہاتھ بندھے ہوں اور دل میں خنجر گھونپا جائے۔ آپ اپنے بچوں کو روتا دیکھتے ہیں اور انہیں کوئی وعدہ بھی نہیں کر سکتے۔ امداد کی جگہیں موت کے پھندے ہیں۔ آپ یا تو آٹا لے کر لوٹتے ہیں یا کفن میں لپٹے ہوئے گھر آتے ہیں۔'' چار بچوں کی ماں، ۴۲ برس کی خدیجہ خضیر کہتی ہیں کہ تین دن میں صرف ایک روٹی ملتی ہے۔ وہ اکثر چولہے پر پانی چڑھا دیتی ہیں تاکہ بچے سمجھیں کھانا پک رہا ہے۔ گھنٹوں کے انتظار کے بعد وہ بھوکے ہی سو جاتے

ہیں۔ کبھی کبھار فوجی جہاز امدادی غبارے گراتے ہیں۔ ہزاروں لوگ ان پر جھپٹتے ہیں۔ مگر یہ سامان چند درجن خاندانوں کے لیے ہوتا ہے۔ غزہ کے صحافی کہتے ہیں یہ امداد نہیں بلکہ ذلت ہے۔ غزہ کو روزانہ کم از کم ۸۰۰ ٹرکوں کی ضرورت ہے۔ اسرائیل ۵۰ سے ۱۵۰ ٹرک داخل ہونے دیتا ہے۔ یہ سرحد پر تعینات سپاہیوں کے موڈ پر منحصر ہے۔ العریش شہر اور رفح کراسنگ کے درمیان ایک ٹرک ڈرائیور مدحت محمد، جن کے ٹرک میں جام اور دالیں بھری ہوئی ہیں، بتا رہے ہیں: ''میں نے دو ہفتے انتظار کیا اور پھر کہا گیا واپس جاؤ۔ اسرائیلی فوجی سوال کر رہے تھے کہ اتنا زیادہ کھانا کس کے لیے لے جا رہے ہو؟ بعض اوقات جواب صرف یہ ہوتا ہے: وقت ختم ہو گیا۔'' اسی طرح محمود الشیخ، جو آٹا لے کر ۱۳ دن سے کراسنگ کے باہر انتظار کر رہے ہیں، کا کہنا تھا کہ کل ہی ایک دن میں ۳۰۰ ٹرک واپس کر دیے گئے اور صرف ۳۵ کو اندر جانے دیا گیا۔ ''سب کچھ ان (اسرائیلی فوجیوں) کی مرضی پر منحصر ہے۔'' وہ بتاتے ہیں کہ ہر رات ۱۵۰ ٹرک لائن میں لگتے ہیں۔ صبح صرف ۱۵ یا ۲۰ کو جانچ کے لیے بلایا جاتا ہے، باقی سب کو لوٹا دیا جاتا ہے۔

جب ٹرک اندر پہنچ بھی جائیں تو ڈرائیور کی اذیت ختم نہیں ہوتی۔ ٹرک اکثر لوٹ لیے جاتے ہیں۔ بھوک تشدد میں بدل جاتی ہے۔ اسرائیلی اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ان کو فائرنگ کرنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ مئی سے اب تک ۲۵۰۰ افراد بس غذائی اجناس تقسیم کرنے والی جگہوں پر مارے گئے اور ۱۵ ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اسی پس منظر میں میڈیسن سان فرنٹیئر نے امریکا۔ اسرائیل کی پشت پناہی والے غزہ ہیومینیٹیرین فاؤنڈیشن پر الزام لگایا کہ یہ ریلیف کا نظام کم اور ''ظلم کی تجربہ گاہ'' زیادہ ہے۔ ایک نرس نے بتایا کہ اس نے پانچ سالہ بچے کا علاج کیا جو بھگدڑ میں کچلا گیا تھا۔ ایک اور آٹھ سالہ بچے کے سینے میں گولی کا زخم تھا۔ عام فلسطینیوں کے لیے کھانے کی تقسیم بھوک اور موت کے درمیان کا جُوا بن چکی ہے۔ فلسطینی اسے ''موت کی یاترا'' کہتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی مرد، عورتیں اور بچے کئی کلومیٹر پیدل چلتے ہیں ''محفوظ راستوں'' کی طرف، جو امداد کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ بہت سے واپس نہیں آتے۔ اسنائپر فائر اور ڈرون حملے قطاروں میں لگے لوگوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ ام سعید الرفاعی، جو رفح کے قریب ایک غذائی تقسیم کے مقام پر گئیں، خالی ہاتھ اور آنسو گیس کے زخموں کے ساتھ واپس گھر پہنچیں۔ ''میں صرف اپنی بیٹی کو کچھ کھلانا چاہتی تھی، مگر ہم پر حملہ ہوا: مرچ اسپرے، گولیاں، گیس۔ میں سانس نہیں لے پائی۔ جان بچا کر بھاگی۔ خالی ہاتھ لوٹی۔'' ان کے الفاظ غزہ کی نئی حقیقت ہیں: اب زندہ واپس آ جانا ہی کامیابی ہے، چاہے کھانا نہ ملا ہو۔

اقوام متحدہ کے نظام آئی پی سی نے پہلے ہی غزہ کو قحط زدہ قرار دیا ہے۔ عالمی قانون کے تحت جان بوجھ کر بھوکا رکھنا جنگی جرم ۲۰۲۴ء ہے۔ تین بار عالمی عدالتِ انصاف نے اسرائیل کو ہدایت دی کہ انسانی امداد بلا رکاوٹ داخل ہونے دے۔ ہر فیصلے کو نظر انداز کیا گیا۔ استنبول یونیورسٹی کے وکیل دنیز باران کہتے ہیں کہ اسرائیل کی ناکہ بندی اور امداد روکنا شہریوں کو جنگی ہتھیار کے طور پر بھوکا رکھنے کے مترادف ہے، جو جنیوا کنونشن کے تحت ممنوع ہے۔ ''یہ منظم، دانستہ اور بے مثال ہے۔ ایک ایسا قحط جو براہِ راست نشر ہو رہا ہے۔'' جب رفح پر ٹرک رکے پڑے ہیں تو بحیرہ روم کی طرف مزاحمت کی ایک اور شکل گلوبل صمود فلوٹیلا کی صورت میں ساحل کی طرف رواں ہے۔ ۴۴ ممالک کے ۵۰ سے زائد جہاز غزہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ جدید تاریخ کا سب سے بڑا شہری امدادی قافلہ ہے۔ اس فلوٹیلا میں ڈاکٹر، پارلیمانی اراکین، فنکار اور کارکن شامل ہیں، جن میں گریٹا تھنبرگ بھی ہیں۔ یہ جہاز خوراک، دوا اور امید سے لدے ہوئے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ بھی رفح کے ٹرکوں کی طرح غزہ سے چند میل دور ہی رک جائیں۔

بھوکوں کے لیے یہ ایک اور ستم ظریفی ہے، خوراک سامنے ہے مگر سفاک ناکہ بندی اس کو روک لیتی ہے۔ ۱۹۷۹ء کے مصر۔ اسرائیل امن معاہدے کے تحت فلاڈیلفی روٹ بفر زون قائم کیا گیا۔ دوسری انتفاضہ (۲۰۰۰ء) کے دوران اسرائیل نے اسے وسیع کیا، گھر گرائے اور رکاوٹیں بنائیں۔ ۲۰۰۸ء میں جنگجوؤں نے دیوار میں سوراخ کیے اور ہزاروں فلسطینی مصر میں داخل ہو کر سامان لائے۔ مصر نے بعد میں سرحد کو مزید مضبوط کیا اور ۲۰۲۱ء تک تین ہزار سے زائد سرنگیں تباہ کر دیں۔ کچھ میں پانی بھرا گیا، کچھ میں زہریلی گیس بھری گئی، اور اکثر اندر موجود لوگ مارے گئے۔ ۲۰۰۷ء سے حماس کے اقتدار میں آنے کے بعد مصر نے غزہ کو ہمسایہ بھی سمجھا اور خطرہ بھی۔ نتیجہ ایک ایسی سرحد ہے جو کنکریٹ اور بدگمانی سے بنی ہوئی ہے۔۔۔ اور آج بھوک سے۔ میں نے کشمیر، افغانستان اور حال ہی میں شام کی رپورٹنگ کی ہے، لیکن غزہ ایک جہاندیدہ رپورٹر کو بھی توڑ دیتا ہے۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ جب میں غزہ کے ایک صحافی کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو کئی بار کال کے بعد جب اس نے فون اٹھایا، تو لرزتی آواز میں کہا: ''بھائی، تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ جب روٹی ملے گی تو کال کروں گا''۔ وہ کبھی کال نہیں کر پایا۔ میں نے بھی دوبارہ فون نہیں کیا۔ غزہ اب صرف جنگ کا نہیں بلکہ بھوک کو ہتھیار بنانے کا معاملہ ہے۔ یہ قحط چھپایا نہیں گیا بلکہ براہِ راست دکھایا جا رہا ہے۔ آنے والی نسلیں یہ نہیں پوچھیں گی کہ فلسطینیوں نے مزاحمت کیوں کی، وہ یہ پوچھیں گی: دنیا کیسے کھاتی رہی جبکہ غزہ بھوکا تھا؟ ایک بوجھ کے ساتھ میں قاہرہ اور پھر انقرہ واپس روانہ ہو رہا ہوں۔ رفح سے قاہرہ تک کا یہ سفر اب صرف جغرافیائی فاصلہ نہیں بلکہ انسانی ضمیر اور عالمی سیاست کے درمیان حائل اس دیوار کا استعارہ ہے جو محصور غزہ کے عوام کے گرد کھڑی کر دی گئی ہے۔ سینائی کے سنسان ریگستان میں سفر کرتے ہوئے لگتا ہے کہ یہ صحرا اپنی خاموشی میں لاکھوں دبی ہوئی صداؤں کا نوحہ پڑھ رہا ہے۔ ریت کے ذرّے بھی جیسے سوال کر رہے ہوں کہ آخر انسان نے انسان کو بھوک اور پیاس کا شکار کیوں بنایا؟

غزہ کی کہانی محض ایک خطے کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی آزمائش ہے۔ یہ ایک ایسا امتحان ہے جس میں صرف فلسطینی نہیں بلکہ ہم سب شریک ہیں۔ رفح کے گیٹ پر کھڑی خوراک انسانیت کے مردہ ضمیر پر نوحہ پڑھ رہی ہے۔ دنیا بھر کی طاقتیں، اقوام متحدہ کی قراردادیں اور عالمی عدالتوں کے فیصلے اس بھوک کے سامنے بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ میں جب قاہرہ لوٹ رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ تاریخ آنے والی نسلوں سے یہی سوال پوچھے گی: ''کیا تم نے کھاتے ہوئے غزہ کے بچوں کو بھوکا مرنے دیا؟'' یہ سوال ہمارے عہد کی سب سے بڑی گواہی بن جائے گا۔ فلسطینی مائیں جب بھوکے بچوں کو گود میں لے کر سلاتی ہیں، تو ان کی لوریاں دراصل دنیا کے کانوں پر دستک ہیں۔ اگر یہ دستک ہم نے نہ سنی تو شاید کل ہماری اپنی اولاد بھی اسی اندھی بھوک کی زد میں آ جائے گی۔ غزہ آج صرف ایک جغرافیہ نہیں، ایک چیخ ہے۔ یہ چیخ وقت کی دیواروں کو چیر کر ہماری روحوں کو ہلا رہی ہے۔ سوال یہ ہے: کیا ہم جاگیں گے یا یہ چیخ تاریخ کے قبرستان میں دب جائے گی؟

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۱۸ ستمبر ۲۰۲۵ء)

سائبر سکیورٹی کا دردِ سر

Martha García Torres Landa

دنیا بھر میں سائبر سکیورٹی کا مسئلہ سنگین شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ کیا ترقی یافتہ اور کیا پسماندہ--- تمام ہی ممالک کا معاملہ یہ ہے کہ سائبر حملے بڑھ رہے ہیں اور سسٹمز کو محفوظ رکھنے کے حوالے سے ذمّہ داری بڑھتی جارہی ہے۔ سائبر سکیورٹی کا معاملہ سنگین شکل اس لیے اختیار کرگیا ہے کہ آج کے انسان کو قدم قدم پر انٹرنیٹ اور نیٹ ورکنگ کی ضرورت پڑتی ہے۔ زندگی کے کم و بیش تمام ہی معاملات اب انٹرنیٹ یا سائبر اسپیس سے جُڑچکے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں خرابیاں بھی بہت زیادہ پیدا ہوئی ہیں۔ ہر انسان کو اپنے لیے محفوظ ترین طریقے درکار ہیں جن کے ذریعے وہ سائبر اسپیس میں اپنے معاملات نپٹاسکے۔

آج ہماری زندگیاں پہلے سے کہیں زیادہ آپس میں جُڑی ہوئی ہیں۔ ہم سب صحت، مالیات، توانائی، تعلیم اور ٹرانسپورٹیشن سمیت تمام اہم امور میں ڈیجیٹل سسٹم پر زیادہ سے زیادہ منحصر ہوتے جارہے ہیں۔ ایک بنیادی مسئلہ یہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے کہ جن سسٹم پر ہم انحصار کرتے ہیں، اُنہیں کسی بھی وقت نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ ہیکرز براہِ راست بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور وائرس والے پروگرام اور فائلز کے ذریعے بھی سسٹم پر حملے کیے جاتے ہیں۔ انٹرنیٹ یعنی سائبر اسپیس میں دی جانے والی خدمات پر ہمارا انحصار بہت بڑھ چکا ہے۔ اگر سائبر اسپیس پر حملے بڑھ جائیں اور بنیادی سہولتیں فراہم کرنے والے سسٹم متاثر ہوں تو ہماری مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔

اسپتال تا گرڈ کوئی محفوظ نہیں!

ہم جانتے ہیں کہ ہیکر کسی بھی سسٹم کو نشانہ بنا کر بہت حد تک مفلوج کرسکتے ہیں۔ اسپتالوں کی ڈیٹا بیس پر سائبر حملوں کے نتیجے میں زندگی بچانے والی خدمات بھی شدید متاثر ہوسکتی ہیں۔ مالیاتی اداروں کے آن لائن سسٹم پر کیے جانے والے حملے غیر معمولی نقصان کی راہ ہموار کرسکتے ہیں، متعلقہ مارکیٹ پر بُری طرح اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ جب ہیکر کسی گرڈ سسٹم اور ڈیٹا بیس پر حملے کرتے ہیں تو لاکھوں افراد کے لیے بجلی کی فراہمی شدید متاثر ہوتی ہے۔

سائبر کرمنل انفرادی حیثیت میں کام کر رہے ہوں یا منظّم گروہ کی شکل میں یا پھر حکومتوں کی ایما پر، جب وہ چند خاص شعبوں کو نشانے پر لیتے ہیں، ڈیٹا بیس کو متاثر کرتے ہیں، تب معاملہ محض مالی نقصان سے کہیں زیادہ کو ہوتا ہے۔ لاکھوں زندگیاں داؤ پر لگ جاتی ہیں اور مُعاشرتی اَفعال کا تسلسل بھی دَم توڑنے لگتا ہے۔

ایسے ڈیجیٹل عہد میں کہ جب سائبر حملوں کے خطرات گھنٹہ وار بنیاد پر بڑھ رہے ہیں، ہمارے قانونی اور ریگولیٹری فریم وَرک اب تک بہت فرسودہ ہیں، ماضی میں جَڑیں رکھتے ہیں۔ معاملات جامد سوچ کی گِرفت میں ہیں۔ ایک بنیادی مسئلہ یہ بھی ہے کہ توانائی، پانی، صحتِ عامّہ اور مالیات سمیت تمام ہی بنیادی اور انتہائی حسّاس بنیادی ڈھانچے اب تک ایسی ٹیکنالوجی کی بنیاد پر کام کر رہے ہیں جنہیں وضع کرتے وقت سائبر سکیورٹی کو ذہن میں رکھا ہی نہیں گیا تھا۔

پروگرامیبل لاجک کنٹرولرز (پی ایل سیز)، انڈسٹریل کنٹرول سسٹم (آئی سی ایس) اور آپریشنل ٹیکنالوجی بالعموم عشروں پُرانی استعمال کی جارہی ہیں۔ اِس کے نتیجے میں اِن میں ایسی خامیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں جن کے نتیجے میں سائبر کرمنلز کے لیے اِنہیں نشانہ بنانا بہت آسان ہوجاتا ہے اور وہ موقع سے فائدہ اٹھانے میں ذرا دیر نہیں کرتے۔

سائبر اسپیس پر حملوں میں اضافہ تو ہو ہی چکا ہے، رہی سہی کسر انٹرنیٹ آف تھنگز (آئی او ٹی) ڈیوائسز اور انٹرکنیکٹیڈ اسمارٹ سسٹمز نے پوری کردی ہے جن کے باعث حملوں کی تعداد اور گنجائش بہت بڑھ گئی ہے۔ کسی بھی شعبے میں جدّت سے بہت سی آسانیوں کی راہیں کُھلتی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ چند خطرات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کا یہی معاملہ ہے۔

ہیکرز کے ہاں جدّت کی بہت اہمیت ہے۔ وہ کسی بھی سسٹم کو نشانہ بنانے کے لیے نئے نئے طریقے آزماتے ہیں۔ وہ جدید ترین ٹیکنالوجی پر گہری نظر رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ نیا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف سائبر سکیورٹی یقینی بنانے سے متعلق قوانین اور قواعد وضوابط اِس دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ بیوروکریسی کے معاملات بہت پیچیدہ رہتے ہیں۔

شمالی امریکا کی پریشانی

امریکا اور کینیڈا کے بارے میں کون یہ گمان کرسکتا ہے کہ وہ جدید ترین ٹیکنالوجی میں کسی سے پیچھے ہوسکتے ہیں؟ دونوں ملکوں کی معیشت ترقی یافتہ ہے۔ معیشت کے ڈیجیٹل پہلو کی بات کی جائے تو حقیقت یہ ہے کہ امریکا اور کینیڈا نے غیر معمولی پیشرفت کی ہے مگر سائبر سکیورٹی کے معاملے میں وہ بھی بہت سی الجھنوں کا شکار ہیں۔ اِن دونوں ترقی یافتہ ملکوں میں معیشت اور انفرادی زندگی کا ہر پہلو سائبر اسپیس سے جُڑا ہوا ہے۔ اِس کے نتیجے میں ہیکرز کے حملے بھی بڑھ گئے ہیں اور وائرس والی فائلز اور پروگرام کے ذریعے انفرادی ڈیجیٹل اکاؤنٹس اور پلیٹ فارمز کو نشانہ بنانے کا عمل بھی تیز ہوگیا ہے۔ ۲۰۲۱ء میں دی کالونیل پائپ لائن نامی وائرس نے دراصل ایک ویک اَپ کال دی تھی۔ آپریشنل ٹیکنالوجی میں ایک ذرا سی نقب نے امریکا کے مشرقی ساحل کی ریاستوں میں لاکھوں افراد کو بجلی سے محروم کردیا تھا۔ تب امریکیوں کی اکثریت کو اندازہ ہوا تھا کہ اُن کے بنیادی نظام کس قدر کمزور ہیں اور کس طور اُنہیں کسی بھی وقت نشانے پر لیا جاسکتا ہے۔ دی کالونیل پائپ لائن کے ذریعے سائبر کرمنل گروپ ڈارک سائڈ نے کرپٹو کرنسی میں ۴۴ لاکھ ڈالر کا تاوان وصول کیا تھا۔ اِس تاوان کی اصل قیمت تو عوام کو ادا کرنا پڑی جنہیں ایندھن مہنگا خریدنا پڑا۔ اور ایسا نہیں ہے کہ یہ کوئی انوکھا معاملہ تھا۔ شمالی امریکا میں ایسے واقعات بڑھتے جارہے ہیں۔

۲۰۲۲ء میں صرف امریکا میں اہم اور حساس بنیادی ڈھانچے والے ۸۷۰/اداروں پر سائبر حملے کیے گئے۔ اِس کے نتیجے میں بہت سے اسپتال، توانائی اور ٹرانسپورٹ کے ادارے اور کاروباری گروپ شدید متاثر ہوئے۔

یہ بات بہت عجیب ہے کہ ایک طرف تو سائبر حملوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے اور دوسری طرف اُن سے نپٹنے کے اقدامات برائے نام ہیں اور اِس حوالے سے اوّل تو قوانین بہت کم ہیں اور جو ہیں اُنہیں ڈھنگ سے نافذ کرنے کا نظام بھی بہت کمزور ہے۔ حکومتوں کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ کاروباری دنیا اور سیاست دانوں کے درمیان تال میل کے ہاتھوں بہت کچھ داؤ پر لگتا رہتا ہے اور خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ سائبر اسپیس پر حملے بڑھتے جارہے ہیں مگر حیرت انگیز طور پر افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ جوابی اِقدام کے طور پر جو کچھ بھی کیا جارہا ہے، وہ ناکافی اور نیم دِلانہ ہے۔ کچھ نہ کرنے کی صورت میں جو نقصان ہوگا، وہ بہت زیادہ ہوگا

کیونکہ اب تک تو یہی ثابت ہوا ہے۔ سوال صرف مالی نقصان کا نہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ حکومتیں اور کاروباری و سماجی ادارے جب سائبر حملوں کی روک تھام کے لیے معقول اور بروقت اقدامات نہیں کرتے تب عوام کا اعتماد مجروح ہوتا ہے اور وہ زیادہ بھروسا نہیں کرتے۔ شمالی امریکا میں سائبر اسپیس کے حوالے سے ریگولیٹری لینڈ اسکیپ اب بھی سائبر حملوں کی روک تھام کے حوالے سے کیے جانے والے اقدامات کے معاملے میں بہت پیچھے رہتے ہوئے کام کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ انتہائی خطرناک ہے۔

مشرقی یورپ پیچھے رہ گیا

ڈیجیٹل پرائیویسی میں یورپ کو بالعموم عالمی لیڈر قرار دیا جاتا ہے۔ اِس کا سہرا جنرل ڈیجیٹل پروٹیکشن ریگولیشن کے سَر ہے۔ یہ معاہدہ ۲۰۱۸ء میں کیا گیا تھا۔ جی ڈی پی آر ڈیٹا کو تحفظ فراہم کرنے والے بہترین فریم ورکس میں سے ہے۔ اِس کے ذریعے یورپی یونین کے باشندوں کی ذاتی معلومات کو غیر معمولی حد تک تحفظ ملتا ہے۔ جی ڈی پی آر نے ڈیجیٹل رائٹس کے حوالے سے نیا گلوبل بینچ مارک قائم کیا۔ اِس کے نتیجے میں عام افراد کو اپنے ڈیٹا تک رسائی کے علاوہ اُسے درست یا ڈیلیٹ کرنے کا اختیار ملا۔ جب عوام اس معاملے میں زیادہ باشعور ہوئے تو کاروباری اداروں سے بھی مطالبہ کیا جانے لگا کہ وہ بھی شفافیت کی راہ پر گامزن ہوں اور اپنا ڈیٹا سامنے لائیں۔ عوام میں یہ احساس بھی بڑھنے لگا کہ کاروباری اداروں کا بھی مواخذہ کیا جانا چاہیے تاکہ اُن کی کارکردگی بہتر ہو اور عوام کو اُن سے زیادہ سے زیادہ فوائد پہنچ سکیں۔

ایک بڑی اور شرمناک اُلجھن یہ بھی ہے کہ یورپی یونین میں سائبر حملوں سے بچاؤ کے لیے جو اِقدامات کیے جاتے ہیں، وہ مشرقی یورپ میں بہت حد تک ناپید ہیں۔ مشرقی یورپی سے امتیازی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مشرقی یورپ بالعموم روس کے زیرِ اثر رہتا ہے۔

جن ممالک میں اداروں کی سکت معمولی ہے اور ریگولیٹری انفرا اسٹرکچر کمزور ہے، وہاں جی ڈی پی آر کی طاقت اور اطلاق محض زبانی کلام ہے، کاغذ پر ہے۔ مشرقی یورپ کے ممالک میں جی ڈی پی آر کے نفاذ کی ذمہ داری ڈیٹا پروٹیکشن اتھارٹی کی ہے۔ ان اداروں کے وسائل اور نفاذ کی قوت میں بہت فرق ہے۔ قوانین اور قوائد کی خلاف ورزیوں کا سراغ لگانا اور درستی کی کوشش بہت مشکل کام ہے۔ اِس کے لیے بہت اچھا بنیادی ڈھانچا درکار ہوتا ہے۔

مشرقی یورپ کے بہت سے ممالک میں سائبر حملوں کی روک تھام سے متعلق نظام اچھی طرح کام نہیں کرتا۔ کارکردگی کبھی بہت اچھی رہتی ہے اور کبھی بہت خراب۔ تفتیش اور تحقیق برائے نام ہوتی ہے اور جرمانے بھی خاصے کمزور ڈھیلے ہوتے ہیں۔ سائبر کرمنلز کو چونکہ سزاؤں اور جرمانوں کا زیادہ خوف لاحق نہیں ہوتا، اِس لیے وہ ڈرتے بھی نہیں اور جو بھی جی میں آئے، کر گزرتے ہیں۔ نفاذ کے اس فرق سے جی ڈی پی آر کی تاثیر میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اِس کے نتیجے میں یورپی یونین کے اندر ہی دو رفتاروں والی پرائیویسی ریجم پائی جاتی ہے۔ مغربی یورپ کے شہری تو جی ڈی پی آر کے ذریعے اپنے ڈیٹا کے معاملے میں مکمل تحفظ کے مزے لُوٹ رہے ہیں جبکہ مشرقی یورپ کے باشندے اس معاملے میں سائبر کرمنلز کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اُنہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کا کیس

مشرقِ وسطیٰ میں سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے سائبر سکیورٹی کا معیار بلند کرنے پر خاطر خواہ توجہ دی ہے اور اِس کا سبب یہ ہے کہ اُن کے پاس وسائل کی کمی نہیں۔ سائبر سکیورٹی کے لیے جس قدر فنڈنگ درکار ہے، یہ ممالک فراہم کرتے ہیں۔ دیگر ممالک اب تک کچھ خاص کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اِس معاملے میں اب تک دوراہے پر کھڑا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے بہت سے ممالک ٹیکنالوجی میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ وہ جدّت کے ذریعے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سائبر حملے روکنے کی صلاحیت و سکت کا گراف بلند کرنا بھی لازم ہے مگر اِس طرف بہت زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی۔

سعودی عرب نے نیشنل سائبر سکیورٹی اتھارٹی بنائی ہے۔ یہ ادارہ متعلقہ قوانین اور قواعد و ضوابط کو انتہائی سختی سے نافذ کرتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں توانائی، صحتِ عامّہ، مالیات اور دوسرے بہت سے اہم شعبوں میں ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کا کردار وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں یہ بات ناگزیر دکھائی دیتی ہے کہ متعلقہ ممالک سائبر سکیورٹی کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ اتھارٹی کے مالک ہوں۔ سائبر سکیورٹی اب کوئی آپشن نہیں بلکہ ناگزیر اقدام ہے۔ جو ممالک اس حوالے سے ڈھیل برتتے ہیں، وہ شدید نوعیت کے نقصانات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں سائبر حملے محض جرائم نہیں ہوتے بلکہ سیاسی اور اسٹریٹجک سطح پر اثر و رسوخ مرتب کرنے اور ریاستی سطح پر دردِ سر بننے والے ہتھیار بھی ہوتے ہیں۔ اِن حملوں سے سلامتی کو تو خطرات لاحق ہوتے ہی ہیں، معاشرے بھی الجھن کا شکار ہوتے ہیں۔ جاسوسی بھی بہت کی جاتی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے کئی حصوں میں مناقشے بہت زیادہ ہیں، اِس لیے ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے اور اُنہیں سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ یہ پوری صورتحال انتہائی پریشان کُن ہے اور سائبر سکیورٹی اقدامات کو ناگزیر بناتی ہے۔

جن خِطّوں میں حکمرانی کا معیار بہت گرا ہوا ہو اور ڈیجیٹل لیٹریسی بھی برائے نام ہو یا ضرورت سے بہت کم ہو، وہاں خطرات کئی گُنا ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اہم اور حساس بنیادی ڈھانچے (ریاسی ادارے، تیل اور گیس کی پائپ لائن وغیرہ) سائبر کرمنلز کے نشانے پر رہتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے جب چاہیں، اُنہیں نشانہ بناتے ہیں اور مطلوب مقاصد و اہداف حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

لاطینی امریکا کی مشکلات

لاطینی امریکا بھی بہت تیزی سے ڈیجیٹل دور کو اپنا رہا ہے۔ ہاں، ڈیجیٹل اطوار کو جس قدر اپنایا جا رہا ہے، اُسی قدر مشکلات بھی بڑھ رہی ہیں اور ہدف پذیری بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ لاطینی امریکا کے ممالک ڈیجیٹل خدمات پر انحصار بڑھاتے جا رہے ہیں۔ جدید ترین ٹیکنالوجی پر بڑھتا ہوا انحصار اُنہیں ہدف پذیر بھی بڑھا رہا ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز سے مستفید ہوئے بغیر کام چلنے والا بھی نہیں اور دوسری طرف سائبر سکیورٹی کا معیار قابلِ رشک حد تک بلند کیے بغیر بھی دال گلنے والی نہیں۔

دوسرے بہت سے خِطّوں کی طرح لاطینی امریکا میں بھی سائبر سکیورٹی کے حوالے سے قانون سازی سُست رہی ہے اور قوانین کے نفاذ کا معاملہ مزید سُستی اور تاخیر کا شکار رہا ہے۔ ماہرین کی بھی کمی ہے اور بنیادی ڈھانچا بھی معیاری نہیں۔ یا کم از مطلوبہ معیار کا نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اب ڈیجیٹل ایکوسسٹم کسی بھی وقت پھٹ پڑنے کے لیے تیار ہے۔ سائبر کرمنلز نے سائبر سکیورٹی کے حوالے سے پائی جانے والی کمزوریوں کو بھانپ لیا ہے اور حملے بڑھا رہے ہیں۔ حکومتیں پریشان ہیں کہ اِس اُفتاد کا سامنا کیسے کریں۔

لاطینی امریکا کا سب سے بڑا ملک برازیل ہے جس کی معیشت بھی غیر معمولی نوعیت ہے۔ ایک طرف ڈیجیٹل خدمات سے مستفید ہونے کا سلسلہ دراز ہو رہا ہے اور دوسری طرف مالیاتی فراڈ بھی بڑھ رہے ہیں۔ بڑے مالیاتی اداروں

کے جعلی فرنچائز لوگوں سے بہت بڑے پیمانے پر رقوم بٹورنے میں مصروف ہیں اور حکومت بھرپور کوشش کے باوجود ایسے فراڈیوں کا قلع قمع کرنے میں ناکام ہے۔ مشہور اور مقبول شخصیات کے نام سے بھی آن لائن فراڈ عام ہو چکا ہے۔ فیس بک، یوٹیوب اور دیگر سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے ذریعے بھی خوب دھوکا دیا جارہا ہے۔ بہت سے بڑے اور معروف برانڈز کی آڑ میں بھی آن لائن فراڈ عام ہے کیونکہ بہت سے لوگ سوچے سمجھے بغیر کسی بھی انعامی اسکیم کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔

لاطینی امریکا کو عالمی اوسط سے کم و بیش ۴۰ فیصد زائد سائبر حملوں کا سامنا ہے۔ صحتِ عامہ سے حکومتی ڈیٹا بیس تک کم و بیش تمام ہی شعبے کسی نہ کسی حوالے سے اور کسی نہ کسی سطح پر ہدف پذیر ہیں۔ اس حوالے سے حکومتوں کی پریشانی بھی بڑھ رہی ہے۔ بیشتر ہیکرز کے حملے اِس لیے کامیاب نہیں ہوتے کہ وہ جدید ترین ہتھکنڈے اپناتے ہیں بلکہ اِس لیے کہ وہ ''دفاعی اقدامات'' ناقص اور برائے نام ہیں۔ بیشتر کاروباری اداروں اور حکومتوں کا یہ حال ہے کہ سائبر حملوں کو ناکام بنانے کے لیے جو کچھ بھی کیا جانا چاہیے، وہ کرتو رہی ہیں مگر بہت حد تک ناکافی اور نیم دِلانہ انداز سے۔ لاطینی امریکا کے بیشتر ممالک کا یہ حال ہے کہ سائبر سکیورٹی پر خام قومی پیداوار کا ایک فیصد سے بھی کم خرچ کرتے ہیں۔ اس وقت سائبر سکیورٹی پر خرچ کا عالمی معیار خام قومی پیداوار کا کم از کم ایک فیصد ہے۔ علاوہ ازیں لاطینی امریکا میں سائبر سکیورٹی کے حوالے سے تربیت یافتہ افراد کی بھی شدید کمی ہے۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ پروفیشنلز کی زیادہ کھپت نہیں ہے۔ جب ملازمتیں نہیں ہوں گی اور سائبر سکیورٹی پر زیادہ خرچ کرنے کا رجحان ہی نہیں ہوگا تو لوگ کیوں اِس شعبے میں مہارت حاصل کریں گے؟ اِس وقت بھی لاطینی امریکا میں سائبر سکیورٹی کی کم و بیش ۱۳ لاکھ آسامیاں خالی ہیں۔ ریاستی و کاروباری ادارے اس حوالے سے اپنی ترجیحات تبدیل نہیں کر رہے۔ وہ اب بھی سائبر سکیورٹی کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دے رہے۔ اِس کے نتیجے میں خرابیاں ہیں کہ بڑھتی ہی جارہی ہیں۔

لاطینی امریکا میں چھوٹے اور درمیانے حجم کے ادارے معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اس وقت سائبر کرمنلز کے نشانے پر ہیں۔ سائبر سکیورٹی کا ڈھانچا کمزور ہونے کے باعث اِن اداروں کو نشانہ بنانا اور نقصان پہنچانا بھی آسان ہے۔ اِن اداروں کے پاس ایسا بنیادی ڈھانچا نہیں ہے جس کی بنیاد پر سائبر حملوں کو ڈٹ کر مقابلہ کیا جاسکے۔

ایشیا میں چین نے سائبر سکیورٹی پر غیر معمولی توجہ دی ہے۔ پورے خطّے میں سائبر حملوں میں چار سال کے دوران ۱۳۴ فیصد سے زائد اضافہ ہوا ہے۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ایشیا میں بھی ڈیجیٹل عہد کو بھرپور طور پر اپنانے کا رجحان عام ہے۔ اس حوالے سے چین اور بھارت کا موازنہ بہت دلچسپ ہے۔ دونوں ممالک سائبر سکیورٹی پر جو کچھ خرچ کر رہے ہیں، اُس میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ چین میں ڈیجیٹل معاملات ریاست کے تصرّف میں ہیں۔ چین نے سائبر سکیورٹی کو قومی مسئلہ قرار دے رکھا ہے۔ انٹرنیٹ پر حکومت کا کنٹرول غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ اِس کے نتیجے میں فراڈ کی گنجائش بھی برائے نام ہے۔ تمام ڈیجیٹل معاملات پر نظر رکھنے کا جامع نظام موجود ہے۔ اِس کے نتیجے میں چینی حکومت کسی بھی بیرونی سائبر حملے کی روک تمام کے معاملے میں زیادہ دشواری محسوس نہیں کرتی۔ ایک دنیا ہے کہ چینی حکومت پر جابرانہ ہتھکنڈے اپنانے کا الزام عائد کرتی ہے مگر سچ یہ ہے کہ سائبر سکیورٹی کے حوالے سے چین کے بیشتر اقدامات انقلابی نوعیت کے ہیں۔ چینی حکومت نے عوام اور کاروباری اداروں کو محفوظ رکھنے پر بہت توجہ دی ہے۔ آبادی کے اعتبار سے ایسا کرنا لازم تھا کیونکہ اِس معاملے میں ڈھیل برتنے کی صورت میں دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں افراد متاثر ہوسکتے ہیں، اُنہیں مالی نقصان کا سامنا ہوسکتا ہے۔ اِس کے برعکس بھارت میں سائبر سکیورٹی پر خاطر خواہ حد تک توجہ نہیں دی جاتی، ضرورت کے مطابق خرچ نہیں کیا جاتا۔ حکومت خود بھی اِس طرف سے لاپروا ہے اور کاروباری اداروں کا معاملہ بھی بگڑا ہوا ہے۔ ہیکرز جدید ترین ٹیکنالوجی اور ہتھکنڈے اپناتے ہیں۔ ایسے میں کسی بھی ملک کے لیے ناگزیر ہے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی اور متعلقہ طریقوں سے استفادہ کرے۔ بھارت میں کاروباری اداروں کو اس حوالے سے زیادہ بریف کرنے کی ضرورت ہے۔ سائبر سکیورٹی میں غیر معمولی مہارت کے حامل پروفیشنلز کی بہت زیادہ کمی ہے۔ عوام میں بھی اِس حوالے سے شعور بیدار کرنے کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔ چین کی طرح بھارت کو بھی اس معاملے پر پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے طریقِ کار کے تحت زیادہ متوجہ ہونا چاہیے۔ سائبر سکیورٹی چونکہ دنیا بھر کا مسئلہ ہے، اِس لیے معمولی نوعیت کے اقدامات سے کام نہیں چلے گا۔ چھوٹے پیمانے کی سرمایہ کاری بھی ناکافی ہوگی۔

سائبر سکیورٹی چونکہ عالمگیر معاملہ ہے اور کوئی بھی حکومت یا ریاست اپنے طور پر، الگ تھلگ رہ کر کچھ نہیں کرسکتی، اِس لیے معقول بات یہ ہے کہ اس چیلنج سے نپٹنے کے لیے تمام ہی ممالک مل کر کام کریں۔ تعاون بھی بڑھایا جانا چاہیے اور اشتراکِ عمل بھی۔ کمزور ممالک کی مدد کی جائے کیونکہ اُن پر کیے جانے والے سائبر حملے پوری دنیا کے لیے دردِسر بن سکتے ہیں۔ اب یہ انفرادی معاملہ نہیں رہا بلکہ عالمگیر ذمہ داری ہے۔ لازم ہے کہ تمام ممالک مل کر اس حوالے سے کوئی ادارہ قائم کریں جو پوری دنیا کے ڈیجیٹل سسٹم کو سپورٹ کرے اور سائبر کرائمز کے آگے بند باندھے۔ متعلقہ ٹیکنالوجی تمام ہی ممالک کے پاس ہونی چاہئیں۔

سائبر سکیورٹی کے حوالے سے عالمگیر معیارات تیار کرنے اور اُنہیں منوانے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جو ملک اُن معیارات کو قبول نہ کرنا چاہے تو قبول نہ کرے۔ ہم آہنگی ناگزیر ہے۔ ٹیکنالوجی کے فرق کو دُور کرنے پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جی سیون، اوای سی ڈی اور اقوامِ متحدہ جیسے ہمہ جہتی پلیٹ فارمز کو بھرپور سیاسی عزم کے ساتھ اِس میدان میں اُترنا چاہیے اور باتوں سے آگے بڑھ کر عمل پر متوجہ ہونا چاہیے۔ حکومتوں کو اس حوالے سے نجی شعبے کے ساتھ ہاتھ ملانے میں بھی بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کارپوریٹ سیکٹر کے ساتھ مل کر تیار کی جانے والی حکمتِ عملی معاملات کو درست کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ سائبر سکیورٹی کے حوالے سے پائے جانے والے بنیادی ڈھانچے کا بڑا حصہ اِس وقت نجی شعبے کے ہاتھ میں ہے۔ حکومتیں اپنے طور پر اقدامات کا اعلان کرتی ہیں اور نجی ادارے اپنے ڈھنگ سے جواب دیتے ہیں۔ اِس حوالے سے اختلافِ فکر و عمل دُور کرنا لازم ہے۔

سائبر سکیورٹی کے لیے تمام سیکٹرز، حکومتوں اور اسٹیک ہولڈرز کے درمیان معلومات کا تبادلہ، جواب میں تال میل اور تیاری کے حوالے سے بھرپور عزم نمایاں ضرورتیں ہیں۔ اس حوالے سے حکومتوں کو بھی آپس میں اور نجی شعبے کے اداروں سے مکالمہ کرنا چاہیے۔ ایک دوسرے کی الجھنوں کو سمجھے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ڈیجیٹل معیشت کے دَور میں ہم سکیورٹی کے بغیر نہیں جی سکتے۔ عالمگیر سطح پر سکیورٹی صرف اور صرف اشتراکِ عمل سے ممکن بنائی جاسکتی ہے۔ دنیا بھر کے ممالک کو مِل کر کام کرنا ہی پڑے گا۔

(مترجم: ایم ابراہیم خان)

"Hack the planet: Cybersecurity's global race against Chaos". ("The Globalist". Sep 16, 2025)

ہوشیار، ایک کلِک آپ کے وجود کے لیے خطرہ!

منوج ابھیگیان

ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں، جہاں کسی شخص کا وجود اس کے جسمانی وجود تک محدود نہیں ہے۔ آپ کا نام، چہرہ، انگلیوں کے نشان، آنکھ کی پتلی، بینک اکاؤنٹ، ووٹر آئی ڈی، آدھار نمبر، میڈیکل ریکارڈ، اور موبائل لوکیشن۔۔۔ یہ سب مشترکہ طور پر آپ کا ڈجیٹل اوتار بناتے ہیں۔ ان سب کا سرورز پر اسٹور، اپڈیٹ اور تجزیہ کیا جاتا ہے، بغیر آپ کے کنٹرول کے۔ یہ حکومتوں، نجی کمپنیوں، اور اس تکنیکی انفرا اسٹرکچر کے تابع ہے، جو آپ کے لیے غیر مرئی ہے۔

یہ تبدیلی چپکے سے ہوئی ہے۔ پہلے شناخت کے لیے راشن کارڈ، پاسپورٹ یا ووٹر کارڈ جیسے دستاویز کافی تھے۔ اب یہ بایومیٹرک ڈیٹا اور ڈجیٹل کوڈز میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اب آپ کو مٹانے کے لیے نہ ہتھیار، نہ گرفتاری، نہ دھمکی کی ضرورت ہے۔ بس ڈیٹا بیس سے آپ کا ریکارڈ ہٹا دیا جائے تو آپ قانونی طور پر غائب ہو جائیں گے۔ آپ جسمانی طور پر موجود تو ہو سکتے ہیں، لیکن انتظامیہ، بینکوں اور اسپتالوں کی نظروں میں آپ کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔

ووٹر لسٹ سے لاکھوں نام نکالے جانے کی خبریں اس کی ایک مثال ہیں۔ کہیں اسے ڈیٹا اپڈیٹ کہا جاتا ہے، لیکن درحقیقت بغیر کسی واضح وجہ یا معلومات کے ہزاروں لوگوں کو ایک ہی بار میں ووٹر لسٹ سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف ووٹ کا حق چھین رہا ہے بلکہ آپ کے قانونی وجود کو بھی کمزور کر رہا ہے۔

آدھار جیسے مرکزی شناختی نظام سے جوڑ کر دیکھیں۔ اگر کسی دن آدھار ریکارڈ حذف کر دیا جائے تو عام شہری کیا کرے گا؟ عدالت میں بھی شناخت ثابت کرنے کے لیے دستاویز درکار ہیں اور جب آپ کا نام سرکاری ریکارڈ میں بھی نہ ہو تو ثبوت کہاں سے لائیں گے؟

چہرے کی شناخت کی ٹیکنالوجی اس کنٹرول کو مزید گہرا کر رہی ہے۔ یہ ٹیکنالوجی اب شہروں، ریلوے اسٹیشنوں، ہوائی اڈّوں اور یہاں تک کہ محلّوں میں بھی کیمروں میں موجود ہے۔ ایک بار جب آپ کا چہرہ ڈیٹا بیس میں داخل ہو جاتا ہے، تو سسٹم آپ کو ہر بھیڑ، ہر گلی، ہر ویڈیو میں تلاش کر سکتا ہے۔ آپ کہاں گئے، کس سے ملے، کتنا عرصہ ٹھہرے، سب کچھ درج ہوتا ہے۔ کئی ریاستوں میں پولیس اسے جرائم کی روک تھام کے لیے استعمال کر رہی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ صرف مجرموں کا سراغ لگاتی ہے؟ نہیں، یہ سب دیکھ رہا ہے۔ چاہے آپ کسی ریلی، مظاہرے، یا رہائشی علاقے میں ہوں۔

سیاسی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے اس ٹیکنالوجی کا استعمال اب عام ہو گیا ہے۔ اگر آپ کسی احتجاج میں شرکت کریں گے تو آپ کی تصویر ریکارڈ کی جائے گی۔ آپ کی شناخت الگورتھم کے ذریعے ڈیٹا بیس سے منسلک ہو جائے گی، اور آپ کو ممکنہ 'شر پسند' کے طور پر نشان زد کیا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ کوئی جرم کیے بغیر۔ یہ نگرانی صرف کیمروں تک محدود نہیں ہے۔ آپ کا موبائل آپ کے جغرافیائی محل وقوع کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔

ٹیلی کام کمپنیاں اور انٹرنیٹ سروس فراہم کرنے والے آپ کی کالز، میسج میٹا ڈیٹا اور براؤزنگ ہسٹری محفوظ کرتے ہیں۔ ڈجیٹل ادائیگی آپ کے خرچ کرنے کی عادتوں کا نقشہ بناتی ہے۔ سوشل میڈیا آپ کی رائے، فرینڈ سرکل اور سیاسی جھکاؤ کی پیمائش کرتا ہے۔ یہ تمام ڈیٹا یکجا ہو کر آپ کا اتنا درست پروفائل بناتا ہے کہ آپ کے خیالات میں معمولی سی تبدیلی بھی سسٹم کے ذریعے نوٹس کی جا سکتی ہے۔

یہ ڈیٹا صرف آپ کو سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ آپ پر اثر انداز ہونے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اشتہاری کمپنیاں اسے منافع کے لیے استعمال کرتی ہیں، لیکن مقتدرہ کے ہاتھ میں یہ آپ کی رائے بدلنے، رویے کو کنٹرول کرنے اور یہاں تک کہ انتخابات پر اثر انداز ہونے کا ہتھیار بن سکتا ہے۔

ڈیٹا ڈیلیٹ ہونے کا خطرہ اور بھی زیادہ ہے۔ اگر آپ کا بینک اکاؤنٹ غلطی سے بند ہو جاتا ہے، تو آپ کے پاس کاغذی دستاویز ہو سکتے ہیں۔ لیکن بایومیٹرک اور ڈجیٹل شناخت کے معاملے میں، اگر ریکارڈ سرور سے حذف کر دیا جاتا ہے، تو آپ کے پاس کوئی فزیکل ثبوت نہیں رہے گا۔ آپ کی پنشن، میڈیکل ہسٹری، جائیداد کا ریکارڈ، سب کچھ غائب ہو سکتا ہے۔ یہ حذف کرنے کا عمل کسی دشمن کی سازش نہیں بلکہ 'انتظامی غلطی' کہہ کر بھی انجام دیا جا سکتا ہے اور اسے درست کرنے میں برسوں لگ سکتے ہیں۔

ڈیٹا بریچ کا خطرہ بھی سنگین ہے۔ اگر کوئی سرکاری یا نجی ڈیٹا بیس ہیک ہو جاتا ہے، تو آپ کا چہرہ، فنگر پرنٹس، یا آنکھ کی پتلی کا پیٹرن چوری ہو سکتا ہے۔ ان کو پاس ورڈ کی طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ ڈیٹا غلط ہاتھوں میں آ جاتا ہے تو اسے آپ کو پھنسانے یا بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

چہرے کی شناخت بھارت میں طاقت اور نگرانی کی نئی زبان بن رہی ہے۔ دہلی پولیس کے پاس اے آئی پر مبنی نظام ہے جو لائیو سی سی ٹی وی سے مشتبہ افراد کی شناخت کر سکتا ہے۔ تلنگانہ، وڈودرا، جے پور، چنئی اور حیدرآباد جیسے شہروں میں نگرانی کے نیٹ ورک تیزی سے بڑھے ہیں۔ یہ ٹیکنالوجی ریلوے اسٹیشنوں، ہوائی اڈوں، بس اسٹینڈوں اور سرکاری اسکولوں تک پہنچ چکی ہے۔ اسے سکیورٹی اور سہولت کے نام پر فروخت کیا جاتا ہے، لیکن یہ آپ کی ہر سرگرمی کا مستقل ریکارڈ بناتا ہے، جسے کسی بھی ایجنسی کے ساتھ شیئر کیا جا سکتا ہے۔

سال ۲۰۲۵ء میں نیشنل آٹومیٹیڈ فیشیل ریکگنیشن سسٹم (این اے ایف آر ایس) بھارت بھر کے سی سی ٹی وی، آدھار، پاسپورٹ اور جرائم کے ریکارڈ کو مربوط کرنے کی سمت میں گامزن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ہی آپ کا چہرہ اسکین کیا جائے گا آپ کی پوری ڈجیٹل ہسٹری، پتا، آدھار، بینک اکاؤنٹ، سوشل میڈیا پروفائل، ظاہر ہو سکتے ہیں۔ ڈرون نگرانی اس کا نیا ہتھیار ہے۔ چہرے کی شناخت سے لیس ڈرون اتر پردیش، پنجاب اور دہلی میں بھیڑ کے انتظام اور جرائم کی روک تھام کے لیے تعینات ہیں۔

چین کا سوشل کریڈٹ اسکور سسٹم شہریوں کے چہرے، ادائیگی کے ریکارڈ اور سماجی سرگرمیوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ کم اسکور کے نتیجے میں ٹرین ٹکٹ، قرض یا نوکریوں سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ روس میں ماسکو کا کیمرہ نیٹ ورک مظاہرین کو ٹریک کرتا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی امریکا اور برطانیہ میں بھی پولیسنگ کا حصہ ہے، لیکن وہاں قانونی مزاحمت موجود ہے۔ بھارت کے پاس نہ تو شفاف قوانین ہیں اور نہ ہی آزاد نگرانی کا نظام۔ ڈیٹا پروٹیکشن قانون حکومت کو وسیع اختیارات دیتا ہے، عدالتی جائزہ کے بغیر ڈیٹا کو تبدیل یا حذف کیا جا سکتا ہے۔

جب حکومت کے پاس آپ کا مکمل ڈجیٹل پروفائل ہو، تو

وہ آپ کے حقوق کو کنٹرول کرسکتی ہے۔ اسے پہلے سیکورٹی، پھر انتظامی کارکردگی اور آخر میں سیاسی فائدے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا اس کا تیز ترین میڈیم ہیں۔ حکومتیں فیک نیوز کی روک تھام کے نام پر نگرانی کرتی ہیں، لیکن اس کا استعمال سیاسی مخالفت کو ٹریک کرنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔

بھارت میں مزاحمت کا امکان ہے، لیکن وقت کم ہے۔ اگلے چند سالوں میں، یہ نیٹ ورک مکمل طور پر مربوط ہو جائے گا اور ہر سرگرمی کا حقیقی وقت میں تجزیہ ممکن ہو سکے گا۔ تب حکومت ایک بٹن کے کلک سے شہریوں کو کنٹرول کر سکے گی۔ اے آئی کا پیش گوئی کرنے والا معیار اسے زیادہ خطرناک بنا دیتا ہے۔ یہ نہ صرف آپ کے اعمال بلکہ مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیتا ہے، اور بغیر کسی جرم کے آپ کو نشانہ بنا سکتا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈیٹا شہری کی ملکیت ہونا چاہیے۔ آپ کو اپنی معلومات کا آئینی حق ہونا چاہیے۔ ڈیٹا میں تبدیلی یا حذف کرنے کے لیے ایک آزاد عدالتی عمل لازمی ہونا چاہیے۔ نگرانی شفاف اور جوابدہ ہونی چاہیے اور شہریوں کو یہ جاننے کا حق ہونا چاہیے کہ ان کے بارے میں کیا ڈیٹا اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ یہ خیال کہ 'میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے' خطرناک ہے کیونکہ یہ حکام کو بغیر کسی رکاوٹ کے مداخلت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

اگر ابھی اقدامات نہ کیے گئے تو ہم ایک ایسے معاشرے میں تبدیل ہو جائیں گے جہاں آزادی صرف ڈیٹا بیس میں درج ہوگی۔ ایک ہی کلک سے آپ کے وجود کو مٹا دیا جا سکتا ہے۔ بغیر مقابلے، بغیر احتجاج کے۔ یہ ڈیٹا آمریت کا دور ہے اور اسے روکنے کے لیے وقت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۵ر اگست ۲۰۲۵ء)

سیرتؐ کے موضوع پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اوراقِ سیرت ﷺ

مولانا سید جلال الدین عمری

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

مغربی کنارے کی دو حصّوں میں تقسیم کا منصوبہ

مرزا محمد الیاس

اسرائیل نے مقبوضہ مغربی کنارے کو دو ایسے حصّوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ شروع کیا ہے، جس کا ایک مقصد مستقبل میں کسی بھی اعتبار سے فلسطینی ریاست کے تصوّر ہی کو ناکام بنانا ہے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مستقبل میں ایک نیا غزہ ٹھہرا کر اِسے بھی اُسی طرح تورا بورا کر دیا جائے، جس طرح امریکا نے بعض پہاڑوں کو ڈیزی کٹر بموں سے تورا بورا کر دیا تھا۔ اس کا تیسرا مقصد ان علاقوں میں یہودی نوآبادیات کی صورت میں نئی یہودی بستیاں بنانا ہے۔

اسرائیل کے متنازع اور انتہا پسند وزیر خزانہ بزازیل سموٹریک نے ۱۴ر اگست کو ایک منصوبے کا اعلان کیا تھا۔ اب وہ اس بارے میں مختلف حوالوں سے منعقد ہونے والے پروگراموں اور تقریبات میں خطاب کرتے ہیں اور خود ہی اس منصوبے پر مبارک بادیں دیتے اور وصول کرتے ہیں۔

ایک پروگرام میں انہوں نے حال ہی میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ مذاکرات کی میز سے کسی بھی فلسطینی ریاست کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا گیا ہے اور یہ کام نعروں سے نہیں بلکہ عملی اقدامات سے کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ سموٹریک خود بھی آبادکار صہیونی یا نوآبادیاتی صہیونی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب بھی نئی یہودی بستی بنتی ہے، کوئی محلّہ یا گلی بنائی جاتی ہے، کوئی نیا ہاؤسنگ یونٹ قائم کیا جاتا ہے، یہ فلسطینی ریاست کے تابوت میں ایک اور کیل ٹھونکی جاتی ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ مغربی کنارے کو اوسلو معاہدوں کے ذریعے مختلف علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مغربی کنارے کا کل رقبہ ۲۱۸۰ میل یا ۵۶۴۰ مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ یہاں تیس لاکھ یا اس سے کم وبیش فلسطینی آباد ہیں۔ یہ دریائے اُردن کا غربی حصہ یا غربِ اُردن بھی کہلاتا ہے اور بنیادی طور پر لیوانت کے نام سے جانا جانے والا خطّہ ہے۔ فلسطینی یہاں کے آبائی طور پر رہنے والے شہری ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، اس لیے یہ مقبوضہ عرب علاقے کہلاتے ہیں۔

اگر عمومی طور پر سمجھنا ہو تو مغربی کنارے کے علاقوں کو یوں دیکھا جا سکتا ہے:

ایریا A: طولکرم ڈسٹرکٹ — ایریا B: نابلس ڈسٹرکٹ

ایریا C: سلفیت ڈسٹرکٹ — ایریا D: جریکو ڈسٹرکٹ

ایریا E: قلقیلیہ ڈسٹرکٹ — ایریا F: جنین ڈسٹرکٹ

ایریا G: الخلیل ڈسٹرکٹ — ایریا H: رام اللہ ڈسٹرکٹ

ایریا I: بیت اللحم ڈسٹرکٹ

ان ڈسٹرکٹس پر مشتمل ایریاز کو مزید تقسیم کیا گیا ہے، جس طرح E1 یا E2 وغیرہ۔ اگر E ایریا کو ہی لیں تو یہاں یہودی بستیاں E1 میں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ وہ مقبوضہ مشرقی بیت المقدس کے پشت تک چلی گئی ہیں۔ ان کے لیے گزشتہ بیس سال سے کام جاری ہے۔ ایک موقع پر امریکا کے دباؤ پر یہاں تعمیر وتوسیع اور مرمت کا کام کچھ عرصے کے لیے روک دیا گیا تھا۔ یہاں ہر طرح کی آبادکاری اور بستیوں کا کام بین الاقوامی قانون کی رو سے غیر قانونی اور ناجائز ہے۔

اب کہا جا رہا ہے کہ آئندہ چند مہینوں میں یہاں یعنی E1 میں بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کا کام شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد فوراً نئے گھروں کی تعمیر شروع کر دی جائے گی۔ منصوبے کے مطابق یہاں ۳۵۰۰ر اپارٹمنٹس بنائے جانے کا منصوبہ ہے۔ جہاں یہ گھر بنائے جائیں گے، یہ پہلے سے تعمیر شدہ یہودی بستی Maale Adumim میں توسیعی منصوبے کا حصہ ہوں گے۔

E1 کا محلِ وقوع اِس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ واحد جغرافیائی رابطہ ہوگا جو مغربی کنارے کے بڑے شہروں شمال میں رام اللہ اور جنوب میں بیت اللحم کو جوڑے گا۔ یہ وسیع فلسطینی آبادیوں کے علاقے ہیں۔ Maale Adumim کے میئر گائے یفراچ نے اس منصوبے کے بارے میں کہا کہ مجھے اس کا اعلان کر کے خوشی ہو رہی ہے کہ سول ایڈمنسٹریشن نے اس کی تعمیر کی منظوری دے دی ہے۔

یہ بات بہت اہم ہے کہ رام اللہ اور بیت اللحم کا درمیانی فاصلہ ۲۲ کلومیٹر ہے۔ یہ ایک وسیع علاقہ ہے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان سفر کرنے والے کسی بھی فلسطینی کو نہایت مشکل پیش آئے گی اور اسے درمیان میں آنے والی متعدد اسرائیلی چیک پوسٹوں سے گزرنا ہوگا۔ ہر مقام پر پرمٹ دکھانا ہوگا اور سفر کی وجوہات بیان کرنا ہوں گی۔ آزاد فلسطینی ریاست کا خواب دیکھنے والوں کو اُمید تھی کہ وہ بیت اللحم سے رام اللہ تک آسانی سے سفر کر سکیں گے۔ اب یہ خواب محض ایک خواب ہی رہے گا۔

Peace Now تنظیم کا کہنا ہے کہ E1 بنانے کا واحد مقصد فلسطینی ریاست کے خواب کو ہی ختم کرنا ہے۔ اس تنظیم کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں موجود ہمارے دوستوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دو ریاستی حل کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کے ایسے اقدامات کامیاب نہیں ہوں گے۔

اقوام متحدہ نے اسرائیل سے کہا ہے کہ E1 کا منصوبہ اور اسی طرح دیگر علاقوں میں ہر منصوبے سے بین الاقوامی قانون پامال کرنے کا سلسلہ روکا جائے۔ اس بات کا خدشہ اب خطرہ بن رہا ہے کہ ۲۲ کلومیٹر کے وسیع رقبے پر نئی یہودی بستی یا بستیاں تعمیر کی جائیں گی۔

ایک سابق اسرائیلی فوجی کے قائم کردہ رائٹس گروپ کا کہنا ہے کہ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس بارے میں موجود خاموشی کو توڑا جائے۔ یہ دراصل زمین ہتھیانے کے منصوبے ہیں۔ یہ فلسطینی سرزمین کو تنگ کرتے اور یہودی بستیاں وسیع کرتے جا رہے ہیں۔

پہلے ان شہروں میں ۲ لاکھ ۵۰ ہزار یہودی باہر سے لا کر بسائے گئے تھے۔ اب ان کی تعداد ۷ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ نیتن یاہو نے بارہا کہا ہے کہ اب کسی فلسطینی ریاست کا وجود ممکن نہیں ہے۔ اس لیے جو ممالک دو ریاستوں کی بات کر رہے ہیں، وہ اس کو بھول جائیں۔

مغربی کنارے میں نئے منصوبوں کے لیے اسرائیل تشدد کا استعمال کر رہا ہے۔ تشدد کے اس ہتھکنڈے کو Iron Wall Offensive کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا بڑا ہدف مغربی کنارے میں شمال اور جنوب کو الگ تھلگ کرنا ہے۔ فلسطینی شہروں میں تشدد کی نئی لہر دوڑا دی گئی ہے۔ پناہ گزین کیمپوں میں بھی چھاپے، جگہ جگہ گرفتاریاں، سرعام مار پیٹ اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا گیا ہے۔ اسرائیل دنیا کا واحد علاقہ ہے جہاں یہ سب بہت کھلے عام ہو رہا ہے اور قابض فوج ان واقعات میں خود ملوث ہے۔

جب سے اسرائیل کی پارلیمنٹ کنیسٹ نے مغربی کنارے کو ضم کرنے کی قرارداد منظور کی ہے تا کہ وہ یہاں یہودی بستیوں کے ناجائز قیام اور تعمیر و توسیع میں تیزی لا سکے، تشدد اور دہشت گردی میں بھی اس سے کہیں زیادہ اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔

اگر اس سال میں غور کیا جائے تو فروری تا اپریل غزہ پر قبضے کے دعوؤں کی تین بار ناکامی کا ملبہ مغربی کنارے پر بھی ڈال کر جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا گیا۔

رام اللہ کے علاقے ترموحیہ میں اسکول کے بچوں پر اسرائیلی فوج نے اس وقت بلا جواز فائر کھول دیا جب وہ گھر واپس آ رہے تھے۔ اس فائرنگ کی زد میں آ کر ۱۴ سالہ فلسطینی امریکی شہری عمر سعد ہلاک ہو گئے۔ اس سے اگلے دن فوج نے پھر فائرنگ کر کے ۳۰ سالہ فلسطینی خاتون امینہ یعقوب کو شمالی مغربی کنارے کے علاقے سلفیٹ میں ہلاک کر دیا۔

اس سال اپریل تک ۲۰۲۳ء کے بعد سے مغربی کنارے کے مختلف علاقوں میں فائرنگ سے ۸۰۰ فلسطینی شہید کیے جا چکے ہیں۔ ان تمام شہادتوں میں قابض فوج نے قوت کا بے دریغ استعمال کیا اور اس سرگرمی کو زیادہ تر مشغلے کے طور پر اختیار کیا۔

اپریل ۲۰۲۵ء کے آغاز میں ۳۳ سالہ نوجوان حمزہ خماش کو گولی مار دی گئی۔ اس کے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ واقعہ نابلس میں پیش آیا۔ اسی دن قابض فوج نے Dheishah پناہ گزین کیمپ پر حملہ کیا۔ یہ کیمپ جنوبی بیت اللحم میں واقع ہے۔ اس حملے میں ۱۵ سالہ فلسطینی لڑکے اور ۴۶ اور ۵۰ سال کے دو مردوں کو فائرنگ سے شدید زخمی کر دیا گیا۔ اس کیمپ پر حملہ سات گھنٹے جاری رہا۔ اس حملے میں گھر گھر تلاشی، بچوں کو ہراساں کیا جانا، گھریلو سامان کی توڑ پھوڑ اور خواتین کی بے حرمتی اور متعدد گرفتاریاں بھی کی گئیں۔ اس کیمپ پر پمفلٹ بھی گرائے گئے جن میں دھمکی دی گئی کہ تم لوگوں کا بھی وہی حال کیا جائے گا جس کا سامنا طولکرم اور جنین کے فلسطینیوں کو کرنا پڑا، اس لیے اپنے کیمپ میں کسی بھی طرح کی عسکری سرگرمی سے باز آ جاؤ۔ پمفلٹ میں مغربی کیمپ کے ایک محلے کی تصویر بھی تھی جس میں ہزاروں فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال کر ان کی سڑکوں پر پریڈ کرائی گئی تھی۔

جنین میں قابض فوج نے آبادی کو گھروں سے نکالا۔ اس کی فضائیہ نے ان گھروں کو نشانے پر رکھ لیا۔ کیمپ اور اس کے اردگرد سے نوجوانوں کو مشکوک قرار دے کر گرفتار کر لیا۔ ان سے ان کے سیل فون چھین لیے گئے۔ فوجی آپریشن اس وقت شروع ہوا جب سال کے شروع میں سیز فائر معاہدے پر دستخط ہو چکے تھے۔ اسرائیل نے خود ہی اس معاہدے کو توڑا۔ اس کے بعد آپریشن آئرن وال شروع کر دیا گیا۔ پہلے جنین میں اس کو شروع کیا گیا اور پھر دوسرے علاقوں تک پھیلا دیا گیا۔

یہ آپریشن مغربی کنارے کو اسرائیل میں ضم کرنے کی طے شدہ کارروائی کا آغاز تھا۔ اس کا اعلان قابض وزیر خزانہ بزازیل سموٹریک بار بار کر چکے تھے۔ یرغمال اسرائیلیوں کے خاندانوں نے اس بارے میں دعویٰ کیا کہ یہ دراصل بنیامین نیتن یاہو کی طرف سے بزازیل سموٹریک کے لیے ایک رشوت تھی جس کے بدلے میں بزازیل نے سیز فائر پر دستخط کرنا قبول کیا تھا۔

بزازیل سموٹریک کا یہ ایجنڈا ہے کہ وہ فلسطینی پناہ گزین کیمپوں اور وہاں کے باسیوں کو ہر حال میں اور ہر طرح سے کچلنا چاہتا ہے۔ اسرائیلی کابینہ کے ہر رکن کی ذہنیت یہی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مجرمانہ کردار اور ذہنیت کا حامل ہے۔ یہ سب مغربی کنارے کو اسرائیل میں ضم کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی کنارے میں ہونے والے تمام فوجی آپریشن غزہ میں ہونے والے حملوں کی بازگشت ہیں۔ غزہ میں اسرائیل نے زمینی حملے میں رفح کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اسے غزہ پر قبضہ کرنے کی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ مغربی کنارے میں اس کے غیر قانونی اقدامات اس لیے زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ ان کی آڑ لے کر یہودی بستیاں آباد کی جا رہی ہیں۔

اسی سال ۳۰ مارچ کو اسرائیل کی کابینہ نے ایک منصوبے کی منظوری دی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ تبدیل اور ضم شدہ مغربی کنارے میں سڑکوں کا جال کس طرح بچھایا جائے گا، فلسطینی زمینیں کس طرح ختم کی جائیں گی، ان کے گھر کس طرح مسمار کیے جائیں گے اور یہ سڑکیں وہیں سے ہی نکالی جائیں گے۔ اس پلان کے تحت ایک سڑک ایسی ہو گی جو یروشلم سے خم کھاتی ہوئی وادی اردن تک جائے گی۔ اس طرح فلسطینی مسافروں کو بیت اللحم سے جیر کو جانا ہو گا تو وہ ان علاقوں سے الگ ہو جائیں گے اور یروشلم (بیت المقدس) سے ان کا رابطہ ہی ختم ہو جائے گا۔

موجودہ شاہراہ پر فلسطینیوں کو سفر کی اجازت ہے۔ نئی سڑک پر صرف اسرائیلی سفر کر سکیں گے۔ یہ شاہراہ اسرائیل کی نو آبادیات کو یروشلم یعنی بیت المقدس سے ملائے گی۔ اسے مقبوضہ مشرقی بیت المقدس سے وادی اردن تک پھیلا دیا جائے گا۔ اس منصوبے کی اہم بات یہ ہے کہ یہ دوسرا سب سے بڑا منصوبہ ہے جو اسرائیلی یہودی بستی Maale Adumim تک جائے گا جس میں ۴ لاکھ یہودی آباد کیے گئے ہیں۔

اسرائیلی کابینہ کے ۳۰ مارچ کے اجلاس میں ایک اور منصوبے کی بھی منظوری دی گئی جس سے مغربی کنارے کو القدس اور مقبوضہ بیت المقدس کی آبادی سے جدا کر دیا جائے گا۔ جب یہودی بستیوں کو بیت المقدس سے جوڑا جائے گا تو شمال اور جنوب سے مغربی کنارہ الگ کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان منصوبوں کی تکمیل سے مسجد اقصیٰ تک رسائی فلسطینیوں کے لیے خواب بنا دی جائے گی۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''براہِ راست'' لاہور۔ اکتوبر ۲۰۲۵ء)

جنگی جُنون کی گرم بازاری

Pallavi Rao

دنیا بھر میں ایک بار پھر اسلحے کی دوڑ شروع ہو چکی ہے۔ یہ دوڑ حالات نے شروع کی ہے۔ معاملات ہی کچھ ایسے ہیں کہ ہر ملک ڈرا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی دفاعی قوت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرے۔ فضائی معرکہ آرائی کے لیے بھرپور تیاری کا جنون سا پیدا ہو چکا ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ یہ جنون پیدا ہوا ہے یا پیدا کیا گیا ہے۔

اِس وقت دنیا بھر میں فوج کو جدید ترین اسلحے اور تربیت سے لیس کرنے کی دوڑ سی جاری ہے۔ کئی خطوں کی صورتحال انتہائی پریشان کن ہے۔ طاقت کا توازن بگڑ چکا ہے۔ امریکا اور یورپ نے ایک زمانے تک جنگوں اور خانہ جنگیوں کو ہوا دی ہے مگر اب خود اُن کے لیے بھی خطرات انتہائی پریشان کن حد تک بڑھ گئے ہیں۔

یوکرین جنگ اور غزہ کی صورتحال نے معاملات کو بگاڑنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ روس نے یوکرین پر لشکر کشی کر کے یورپ بھر میں دفاعی بجٹ میں اضافے کی راہ ہموار کی اور اِدھر اسرائیل نے غزہ میں قتل و غارت کا بازار گرم کر کے ایسا ماحول پیدا کیا کہ خِطّے کا ہر ملک ڈرا ہوا ہے۔ ہر ملک چاہتا ہے کہ جدید ترین طیارے، ڈرون، نیویگیشن سسٹم اور میزائل زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدے یا پھر اپنے طور پر بنائے۔ مقامی اسلحے پر ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کا انحصار کم ہی رہا ہے۔ اِس معاملے میں وہ ترقی یافتہ دنیا کی طرف دیکھتے رہے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں بجٹ کا بڑا حصہ دفاعی معاملات پر خرچ ہو جاتا ہے اور سماجی بہبود اور معاشی ترقی کے منصوبوں کے لیے کی جانے والی فنڈنگ شدید دباؤ کی زد میں رہتی ہے۔

حال ہی میں پاکستان اور بھارت کے درمیان فضائی معرکہ آرائی ہوئی جس میں ایک دنیا نے دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اِس معرکہ آرائی نے خطے میں اسلحے کی نئی دوڑ شروع کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بحرِ ہند اور بحرالکاہل کے خطے میں بھی معاملات تیزی سے خرابی کی طرف بڑھ رہے ہیں کیونکہ جاپان، آسٹریلیا اور دیگر ممالک چین سے خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ چین اور تائیوان کے درمیان کشیدگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکا بھی خطے میں اپنی موجودگی بڑھانے کی گنجائش پیدا کر رہا ہے اور اِس کے نتیجے میں کسی بڑی جنگ کے خطرے کے پیش نظر اِن خطوں کے بیشتر ممالک دفاعی اخراجات میں اضافے پر مجبور ہیں۔

سرد جنگ کے بعد پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ یورپ کے دفاعی اخراجات مشرقی ایشیا کے ممالک کے دفاعی اخراجات سے بڑھ گئے ہیں۔ قابلِ ذکر اور تشویش ناک بات یہ ہے کہ دفاعی اخراجات کے حوالے سے جو ۱۵ ممالک سرفہرست ہیں، اُن کے مجموعی دفاعی اخراجات ۲ ہزار ارب ڈالر سے زیادہ ہیں جو عالمی دفاعی اخراجات کا ایک چوتھائی ہیں۔ امریکا اِس وقت دفاع پر جو کچھ خرچ کر رہا ہے، وہ دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ خرچ کرنے والے ملک چین کے مقابلے میں تین گنا ہے۔

دنیا بھر میں غیر یقینی بڑھ رہی ہے۔ کئی خطے انتہائی خوفزدہ ہیں۔ یورپ کو یہ خوف ستا رہا ہے کہ یوکرین کی جنگ وسعت اختیار کرتے ہوئے کہیں پورے براعظم کو لپیٹ میں نہ لے بیٹھے۔ روس اپنے دفاعی اخراجات بڑھانے پر مجبور ہے کیونکہ یوکرین کو دباؤ میں رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ گولے داغنے ہیں، میزائل برسانے ہیں۔ یوکرین بھی دفاعی بجٹ بڑھانے پر مجبور ہے کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں روس کے قابض ہو جانے کا خطرہ موجود ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کے ممالک ایک زمانے سے اسرائیل اور امریکا کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں پیدا ہونے اور برقرار رہنے والی صورتحال کی خرابی سے دوچار ہیں۔ غزہ میں اسرائیل نے امریکا کی سرپرستی میں جو کچھ کیا ہے، اُس نے خطے کے تمام ممالک کو انتہائی خوفزدہ کر رکھا تھا۔ رہی سہی کسر اسرائیل اور ایران کی بارہ روزہ جنگ نے پوری کر دی ہے۔ اِس جنگ نے سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، قطر، کویت، بحرین اور خطے کے دیگر ممالک کو دفاعی بجٹ میں اضافے پر مجبور کر دیا ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان حالیہ فضائی معرکہ آرائی نے بہت کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ دونوں ممالک دفاعی بجٹ بڑھانے پر مجبور ہیں۔ جدید ترین طیاروں، نیویگیشن سسٹمز، ڈرون اور میزائلوں کے حصول کی دوڑ سی شروع ہو گئی ہے۔

کیا یورپ، کیا ایشیا اور کیا انڈو پیسفک، تمام ہی خطوں میں زیادہ سے زیادہ دفاعی قوت یقینی بنانے کا معاملہ اوّلین ترجیح کا درجہ حاصل کر گیا ہے۔ جو ممالک معاشی اعتبار سے کمزور ہیں، وہ بھی دفاعی تیاریوں کا گراف بلند کرنے پر مجبور ہیں۔ اِس کے نتیجے میں معیشت مزید کمزور ہو رہی ہے اور تعلیم و صحتِ عامہ سمیت سماجی بہبود کے تمام شعبوں کے لیے کی جانے والی فنڈنگ میں خطرناک حد تک کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہ کیفیت عام انسان کے لیے زندگی کو مزید دشوار بنائے گی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد پہلی بار یورپ میں بھی بھرپور دفاع کے لیے تیار رہنے کا مزاج پیدا ہوا ہے۔ جرمنی، فرانس، برطانیہ اور اٹلی نے صورتحال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے اپنے دفاعی بجٹ میں تیزی سے اضافہ شروع کر دیا ہے۔ کووِڈ کے زمانے میں معیشتوں کا پہیہ تھم جانے کے باعث بہت سے شعبے متاثر ہوئے تھے۔ سماجی بہبود کے لیے کی جانے والی فنڈنگ پر بہت اثر پڑا تھا۔ اِس معاملے میں یورپ انوکھا نہ تھا۔ دنیا بھر میں حکومتوں کے لیے لازم ہو گیا تھا کہ معاملات قابو میں رکھنے کے لیے بہبودِ عامہ کے منصوبوں کے لیے کی جانے والی فنڈنگ میں کٹوتی کریں۔ تب سے اب تک معاملات اِس قدر بگڑے ہوئے ہیں کہ درست ہونے کا نام نہیں لے رہے اور اِس حوالے سے حکومتوں میں عزم کی بھی شدید کمی ہے۔

چین کی بڑھتی ہوئی عسکری اور معاشی قوت نے پورے خطے کے لیے ایک بڑے دردِ سر کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ جاپان اور آسٹریلیا نے چین کے معاملے میں بہت زیادہ دباؤ محسوس کیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دفاعی تیاریوں کا گراف بلند تر رکھا جائے۔ جاپان دفاع پر ۵۵ ارب سالانہ تک خرچ کرنے پر مجبور ہے۔ یہی حال آسٹریلیا کا ہے جو ۳۴ ارب ڈالر کی منزل میں ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۵ \\\\\\

۱۵ بڑے دفاعی بجٹ

امریکا	۹۶۲ ارب ڈالر
چین	۲۴۶ ارب ڈالر
روس	۱۵۰ ارب ڈالر
جرمنی	۱۰۹ ارب ڈالر
برطانیہ	۸۱ ارب ڈالر
بھارت	۷۹ ارب ڈالر
سعودیہ	۷۸ ارب ڈالر
جاپان	۵۵ ارب ڈالر
یوکرین	۵۴ ارب ڈالر
فرانس	۴۷ ارب ڈالر
جنوبی کوریا	۴۵ ارب ڈالر
اٹلی	۴۴ ارب ڈالر
اسرائیل	۳۷ ارب ڈالر
پولینڈ	۳۵ ارب ڈالر
آسٹریلیا	۳۴ ارب ڈالر

بھارت میں سیلاب سے تباہی

لیش راج شرما

مَعاشی مُعاملات میں بہت سی اُلجھنوں کا سامنا کرنے اور اچھا خسارہ برداشت کرنے کے بعد بھارت کی ریاست پنجاب کے علاقے گرداس پور کے ۴۷ سالہ کسان گُرِوندر سِنگھ نے اپنی سب سے بڑی بیٹی کی شادی کے لیے ایک ساہوکار سے سُود پر دس لاکھ روپے کا قرضہ لیا۔ اِس میں سے کچھ رقم بچا کر اُس نے اپنی تین ایکڑ زمین میں بُوائی کی۔ باسمتی چاول کی بُوائی کے بعد وہ خاصا پُرامید ہوکر بیٹھ گیا کہ اب اچھی فصل آئے گی اور وہ اس سے ہونے والی آمدنی سے سارا قرضہ سُود سمیت ادا کرے گا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک ایکڑ سے کم وبیش دس لاکھ روپے کی یافت ہوگی۔

قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ گُرِوندر نے بہت محنت کی مگر ساری محنت پر مُون سُون کی بارشوں نے پانی پھیر دیا۔ اُس کے کھیت بھی پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جس فصل سے اُس نے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، وہ اب کیچڑ میں دَبی ہوئی ہے یعنی کسی کام کی نہیں رہی۔

گُرِوندر سِنگھ نے 'الجزیرہ' کو بتایا کہ اِس بار بارشیں بہت زیادہ ہوئی ہیں۔ سیلاب آیا اور سبھی کچھ بہالے گیا۔ میں عمر کے اُس مرحلے میں ہوں جہاں اِس نوعیت کی تباہی برداشت نہیں کرسکتا۔ ہم لوگ برباد ہوچکے ہیں۔ چاول کی فصل ہم نے بہت پُرامید ہوکر لگائی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اِس فصل سے ہونے والی آمدنی سے ہمارے سارے قرضے چُکتے ہوجائیں گے۔ ہمارے کھیت اِس وقت تالاب بنے ہوئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نئے سِرے سے ابتدا کیسے کریں۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ جب گُرِوندر سِنگھ کا گاؤں زیرِ آب آگیا تو اُس نے اپنی بیوی اور دو بیٹیوں کے ساتھ محفوظ مقام پر پناہ لی۔ اب ایک بڑا مسئلہ گھر واپس جاکر بچی کھچی چیزوں کی نگرانی کرنی ہے۔ سیلاب کی تباہ کاری کے بعد گھر میں دوبارہ آباد ہونا بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔

طویل المیعاد اثرات

رواں سال مون سون کی بارشیں غیر معمولی رہی ہیں۔ بھارت اور پاکستان کے متعدد صوبوں اور علاقوں میں انتہائی نوعیت کی صورتِ حال پیدا ہوئی ہے۔ شمالی بھارت کے بہت سے علاقوں میں معاملات بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ کئی علاقوں میں موسلا دھار بارشوں کے بعد سیلابی صورتِ حال پیدا ہوئی۔ دریا بپھر گئے جس کے نتیجے میں بیسیوں دیہات پوری طرح ڈوب گئے۔ ہزاروں ہیکٹر زرعی اراضی مکمل ڈوب گئی۔

پنجاب میں صورتِ حال بہت زیادہ پریشان کن ہے۔ پنجاب میں ۳۵ فیصد آبادی کا تعلق زرعی شعبے سے ہے۔ اِن لوگوں کی گزر بسر ہی کھیتی باڑی پر ہے۔ کسانوں کو چار عشروں کی بدترین سیلابی کیفیت کا سامنا ہے۔ ہزاروں ایکڑ پر کھڑی فصلیں تباہ ہوئی ہے۔ پنجاب میں کم و بیش دو تہائی زرعی اراضی پر چاول کی بُوائی ہوتی ہے۔

بھارتی پنجاب کے جن اضلاع میں سیلاب کے باعث بہت زیادہ تباہی ہوئی ہے، اُن میں گرداس پور بھی شامل ہے۔ یہ علاقہ دریائے راوی، دریائے بیاس اور دریائے ستلج سے جُڑا ہوا ہے۔ مون سون کے دوران بھارت کے زیرِ انتظام جموں و کشمیر میں بہت زیادہ بارشیں ہوئیں۔ ہماچل پردیش کا بھی یہی معاملہ رہا۔ اِس کے نتیجے میں پنجاب میں بہنے والے دریاؤں میں بہت زیادہ پانی آگیا اور پوری پوری آبادیوں کے لیے بقا کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

رواں سال پاکستان کی طرح بھارتی پنجاب میں بھی بہت بڑے پیمانے پر تباہی واقع ہوئی ہے۔ سیکڑوں افراد لقمۂ اجل ہوئے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہلاکتیں ۵۱ ہیں جبکہ چار لاکھ سے زائد افراد بے گھر ہوئے ہیں۔

پاکستانی پنجاب کی طرح بھارتی پنجاب کو بھی مُلک کے لیے فوڈ باسکٹ کہا جاتا ہے۔ بھارت میں صرف پنجاب کم و بیش ۶ ارب ڈالر کے مساوی باسمتی رائس برآمد کرتا ہے۔ ملک میں چاول کی پیداوار کا ۴۰ فیصد پنجاب سے آتا ہے۔ پاکستانی پنجاب میں بھی سیلاب نے غیر معمولی تباہی مچائی ہے۔ پاکستان بھر میں باسمتی چاول کی ۹۰ فیصد پیداوار پنجاب سے آتی ہے جس کی مالیت کم و بیش ۹۰ کروڑ ڈالر ہے۔

رواں سال مون سون کے دوران بھارتی پنجاب اور اُس سے ملحق ریاستوں میں کم و بیش ۴۵ ہزار ایکڑ پر کھڑی فصلوں کو نقصان پہنچا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ حکومت جس قدر تباہی بتا رہی ہے، اُس سے کہیں زیادہ تباہی واقع ہوئی ہے۔ کسانوں کی مشکلات بڑھ گئی ہیں۔ اُن کی فصلیں تباہ ہوگئی ہیں اور قرضے واپس کرنے کی سکت بھی اُن میں زیادہ نہیں رہی۔ ایسے میں اگر وہ اپنی زمینیں رہن رکھ کر مزید قرضے لیں گے تو مزید اُلجھیں گے اور اُن کے لیے جینا مزید دشوار ہوجائے گا۔ ہر سال سیلاب کے بعد لوگ زندگی کو بحالی کی طرف لانے میں شدید مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔

بھارتی ریاست پنجاب کے شہر پٹیالا میں قائم پنجاب یونیورسٹی سینٹر فار ڈیولپمنٹ اکنامکس اینڈ انوویشن اسٹڈیز کے ڈائریکٹر لکھوِندر سِنگھ کا کہنا ہے کہ فصلیں مکمل طور پر تباہ ہوگئی ہیں، مشینری بھی پانی میں ڈوبی ہوئی ہے اور کسانوں کے گھر بھی بہہ گئے ہیں۔ اُن کی مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ لکھوِندر سِنگھ نے 'الجزیرہ' سے گفتگو میں کہا کہ ماحول میں رونما ہونے والی تبدیلیاں پورے خِطّے کو متاثر کر رہی ہیں۔ پاکستان اور بھارت، دونوں ہی غیر معمولی بارشوں اور سیلاب کا سامنا کر رہے ہیں۔ اب پنجاب کے کسانوں کو نئے سِرے سے زندگی شروع کرنا پڑے گی۔ اُنہیں بہت زیادہ مدد اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ حکومت کو صرف ہمدردی نہیں جتانی اور وقتی امداد کو سب کچھ نہیں سمجھنا بلکہ سرمایہ کاری کرنی ہے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر ڈھنگ سے جینے کے قابل ہوسکیں۔

بھارتی پنجاب میں اِس وقت عام آدمی پارٹی کی حکومت ہے جو مرکز کی حکمراں جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کی مخالف ہے۔ عام آدمی پارٹی کی حکومت نے پنجاب کے سیلاب زدہ کسانوں کے لیے فی گھرانہ ۲۰ ہزار روپے کی عبوری امداد کا اعلان کیا ہے۔ ریاستی حکومت کسانوں کی جو مدد کر رہی ہے، وہ ضرورت سے بہت کم ہے۔ لکھوِندر سِنگھ کا کہنا ہے کہ حکومت کو زیادہ کُھل کر سامنے آنا ہوگا تاکہ کسانوں کا اعتماد بحال ہو اور وہ اپنے مسائل حل کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرسکیں۔

بھارت کی باسمتی چاول کی ۶ فیصد برآمدات امریکا کے لیے ہیں۔ امریکا نے بھارتی برآمدات پر ۵۰ فیصد ٹیرف لگا دیا ہے۔ نریندر مودی اور اُن کے رفقا کے لیے یہ وقت بہت نازک ہے اور امریکا کے بگڑے ہوئے تیور بھارتی معیشت کے لیے مشکلات بڑھائیں گے۔ بھارت میں نصف سے زائد آبادی کا روزگار زرعی شعبے سے وابستہ ہے اور حکومت روایتی طور پر زرعی شعبے کی نگران و مددگار رہی ہے۔

لکھوِندر سِنگھ نے حکومت کو خبردار کیا ہے کہ سیلاب سے ہونے والی تباہ کاریاں اِتنی زیادہ ہیں کہ بھارت کو شاید اناج

درآمد کرنا پڑسکتا ہے۔ اگر امریکا نے غیر معمولی ٹیرف عائد کیے ہیں تو حکومت کسانوں کو اس معاملے میں نہ گھسیٹے۔ پنجاب کے متعدد علاقوں میں سیلاب سے جو تباہ کاری ہوئی ہے، وہ ابھی عرصۂ دراز تک کسانوں کے لیے مشکلات پیدا کرتی رہے گی اور اِس کے نتیجے میں قومی معیشت بھی پریشان کن حد تک متاثر ہوگی۔

ہر طرف پانی ہی پانی

بھارتی پنجاب کے کسانوں کو اِس وقت پانی کا سامنا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ سبھی کچھ زیرِ آب ہے۔ زمینوں پر پانی بھی کھڑا ہے اور کیچڑ بھی۔ پانی سُوکھ کر کیچڑ میں تبدیل ہو رہا ہے۔ جب پانی سُوکھ جائے گا تب زمینوں کی صفائی کرنا پڑے گی تاکہ وہ نئی فصل کے لیے تیار کی جاسکیں۔ یہ سب کچھ آسان نہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ بہت سا کیچڑا سیلابی ریلوں کے ساتھ بہتا ہوا کھیتوں میں بیٹھ گیا ہے۔ کھیتوں کی صفائی اور نئی فصلوں کے لیے تیاری کسانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج ہوگی۔

زرعی پالیسی سے متعلق اُمور کے ماہر اندرا شیکھر سِنگھ کہتے ہیں کہ جب کھیتوں سے پانی نکل جائے گا یا سُوکھ جائے گا تب ہی معلوم ہوسکے گا کہ نقصان دراصل کتنا ہوا ہے۔ نئی فصلوں کے لیے زمین ہموار کرنا بھی ایک بڑا چیلنج ہوگا۔ اِس کی لاگت اچھی خاصی ہوگی۔ اگلے سیزن کی تیاری بہت مہنگی پڑے گی۔

بھارت میں مون سون یا خریف کی فصل چاول کی ۸۰ فیصد پیداوار دیتی ہے۔ چاول کی بُوائی ستمبر کے آخر اور اکتوبر کے شروع میں ہوتی ہے۔ اب پنجاب کے کسانوں کو اگلی فصل کے زمین کی تیاری کے بہت بڑے چیلنج کا سامنا ہوگا۔ وقت بہت کم ہے۔ موسمِ سرما میں گندم کی فصل کی بُوائی ہوتی ہے۔ بُوائی نومبر کے اوائل تک ہوجانی چاہیے۔

اندرا شیکھر سِنگھ کہتے ہیں کہ اب اگر کوئی معجزہ ہو تو اور بات ہے وگرنہ کسانوں کو غیر معمولی مالی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ سیلابی پانی سے کئی بیماریاں پُھوٹ سکتی ہیں اور یوں جو تھوڑی بہت فصلیں کھڑی ہیں، اُنہیں شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کسان ربیع کی فصل کے معیار کے حوالے سے بہت پریشان ہیں۔

بھارت کے کسانوں کا زیادہ مدار یوریا کھاد پر ہے، جس میں تقریباً ۴۶ فیصد نائٹروجن ہوتی ہے۔ یہ اُن کی بنیادی کھاد ہے۔ بھارت یوریا کا سب سے بڑا درآمد کنندہ بھی ہے۔ اِس وقت ملک میں یوریا کھاد کے ذخائر ڈانواڈول ہیں۔ اگست ۲۰۲۴ء میں یوریا کھاد کے ذخائر ۸۶ لاکھ ۴۰ ہزار سے گر کر ۳۷ لاکھ ۱۰ ہزار میٹرک ٹن ہوگئے۔

مُون سُون کے دوران جو تباہ کاری سیلاب کے ہاتھوں ہوئی، اُس کے باعث کئی ریاستوں میں بہت بڑے پیمانے پر یوریا کھاد خریدی گئی ہے۔ سیلاب تو آیا اور تباہی کا بازار گرم کرکے بیٹھ گیا مگر اب کسانوں کو یہ خوف لاحق ہے کہ کہیں یوریا کھاد کا بحران پیدا نہ ہوجائے۔ دنیا بھر میں یوریا کی قیمت بڑھی ہے۔ مئی میں قیمت ۴۰۰ ڈالر فی میٹرک ٹن تھی جبکہ اب یعنی ستمبر میں یہ ۵۳۰ ڈالر فی میٹرک ٹن ہوچکی تھی۔

اِندر شیکھر سنگھ کہتے ہیں کہ پنجاب کے کسانوں کے لیے سیلاب کئی تباہ کاریاں لے کر آیا ہے۔ ایک طرف زمین کی تیاری کا چیلنج ہے۔ دوسری طرف یوریا کھاد کی کمی کا خدشہ بھی ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ جعلی کیڑے مار دواؤں کی بھی بھرمار ہے۔ کسانوں کو ابھی کئی ماہ تک شدید مشکلات کا سامنا رہے گا۔

سیلاب اور حالات کے ستائے ہوئے کسان دن رات یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اب اُن کا اور اُن کے اہلِ خانہ کا گزارا کیسے ہوگا۔ لاکھوں غریب کسانوں کے لیے اب اپنے اور اہلِ خانہ کے لیے تین وقت کی روٹی اور کپڑے لَتّے کا اہتمام کرنا کسی بڑے دردِ سر سے کم نہ ہوگا۔

پاکستان اور بھارت کے مشترکہ دریاؤں سے جُڑے ہوئے علاقوں میں معاملات بہت زیادہ خراب ہیں۔ دونوں طرف کے کسان یکساں طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ سب کا دُکھ مشترکہ ہے۔ ایسے میں مل جُل کر کام کرنے ہی سے بات بنے گی، کام ہوگا۔

بھارت کے کسانوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے دریاؤں کے لیے پاکستان سے لڑیں گے۔ بھارت نے سندھ طاس معاہدے پر عمل موقوف کردیا ہے۔ پاکستان نے بھارتی اقدام کو آبی جارحیت کہا ہے۔ سندھ طاس معاہدے پر عمل موقوف کیے جانے سے پاکستان کی مشکلات بڑھیں گی۔ مشکلات تو بھارت کی بھی بڑھیں گی اور بالآخر کسانوں ہی کو سب کچھ یا بہت کچھ جھیلنا پڑے گا۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

'Restart from scratch': Flood-hit Indian farmers look at swelling losses. ("Aljazeera". Sep 22, 2025)

●●●

بقیہ: جنگی جُنون کی گرم بازاری

اسٹریٹجک امور کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اِس وقت دنیا کا مجموعی مُوڈ ایسا ہے کہ زیادہ سے زیادہ جنگی تیاریوں کا جُنون کم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ بہت سوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ جنگی جُنون کو پروان چڑھانے کے شواہد بھی کچھ زیادہ ڈھکے چُھپے نہیں۔ تھوڑی سی توجہ کے ساتھ معاملات کی کڑیوں کو آپس میں ملاتے جایئے تو بات سمجھ میں آجائے گی۔ اِس وقت بیشتر خطوں میں جدید ترین اسلحے کے حصول اور جنگی تیاریوں کی دوڑ تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے اور یہ سب کچھ ترقی یافتہ دنیا کے اسلحہ ساز اداروں کے حق میں جاتا ہے۔ ایسے میں اِتنا سوچنا تو بنتا ہے کہ اسلحے کی دوڑ کو مہمیز دی جارہی ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Ranked: Top 15 countries by military budgets in 2025". ("visualcapitalist.com". June 27, 2025)

●●●

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ مطبوعات

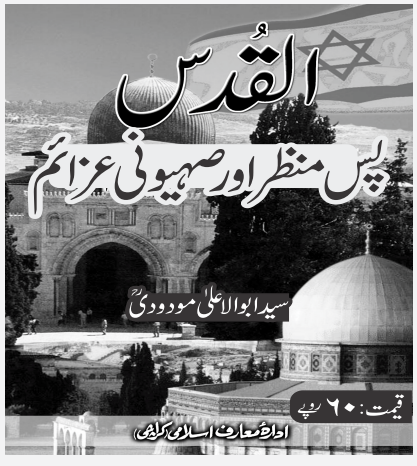

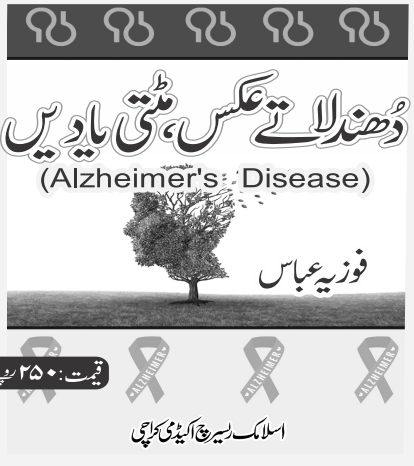

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

بَجٹ خَسارے کی کہانی

دُنیا بھر میں معیشتیں اُلجھنوں کا شکار ہیں۔ یہ مستقل نوعیت کی کیفیت ہے کیونکہ فی زمانہ معیشتیں اُدھار یعنی قرض پر چلتی ہیں۔ کوئی بھی ملک ایسا نہیں جس پر قرضوں کا بوجھ یا دباؤ نہ ہو۔ امریکا ہو یا جاپان، چین ہو یا بھارت، یورپی یونین ہو یا کوئی اور معاشی اتحاد...... سبھی کے لیے قرضے ناگزیر حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہی معاملہ بجٹ خسارے کا ہے۔ ہر ملک کو بجٹ خسارے کا سامنا رہتا ہے۔ معاشی سرگرمیاں، بجٹ خسارہ، قرضے اور دوسرا بہت کچھ ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ اِس وقت بھی دنیا بھر میں درجنوں ممالک غیر معمولی بجٹ خسارے کا سامنا کر رہے ہیں۔ بڑی معیشتوں کے لیے بھی اِس معاملے میں کچھ خاص آسانی دکھائی نہیں دیتی۔

ایسا نہیں ہے کہ معیشتیں قرضوں اور بجٹ خسارے کے بحران سے نمٹنے کی کوششیں نہیں کر رہیں۔ بات یہ ہے کہ اب معاشی لین دَین کی نوعیت ہی کچھ ایسی پیچیدہ ہے کہ کسی بھی ملک کے لیے قرضوں کے بغیر زیادہ دُور تک چلنا ممکن نہیں اور بجٹ خسارے کے ساتھ بھی جینا ہی پڑ رہا ہے۔

دنیا بھر میں حکومتیں قرضوں تلے دَبی ہوئی ہیں۔ دنیا بھر کی حکومتوں کے مجموعی قرضے اب عالمی مجموعی خام پیداوار کے ۹۵ فیصد کے مساوی ہو چکے ہیں۔ یہ انتہائی خطرناک بات ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں معیشتوں کی اندرونی پیچیدگیاں بڑھتی ہیں اور حکومتوں کے لیے بہبودِ عامہ کے منصوبوں کو جاری رکھنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ پریشان کُن بات یہ ہے کہ مجموعی خام پیداوار کے مقابلے میں قرضوں کا تناسب گھٹنے کے آثار نہیں کیونکہ یہ ٹرینڈ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ۲۰۳۰ء تک دنیا بھر کی حکومتوں کے مجموعی قرضے مجموعی عالمی خام پیداوار کے مساوی ہو جائیں گے۔ تب حکومتوں پر کتنا دباؤ ہوگا، اِس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

اِس وقت دنیا بھر کی حکومتوں کا بجٹ خسارہ جی ڈی پی یعنی خام قومی پیداوار کے ۵ء۱ فیصد کے مساوی ہے۔ بجٹ خسارے میں کمی کی اُمید نہیں کی جاسکتی کیونکہ معیشتوں پر بوجھ بڑھ رہا ہے اور اس کے نتیجے میں بجٹ خسارہ بھی خام قومی پیداوار کے تناسب سے بڑھ رہا ہے۔

زیادہ پریشان کُن بات یہ ہے کہ دنیا بھر کی حکومتوں کے لیے قرضوں کے بوجھ سے نجات پانے اور بجٹ خسارے کو قابو میں رکھنے کا ٹاسک مزید مشکل ہو گیا ہے کیونکہ معاشی بحالی کی شرح معمولی ہے اور دنیا بھر میں افراطِ زر پنجے گاڑ رہا ہے۔ حکومتیں اپنی اپنی حُدود میں عام آدمی کی بہبود کے حوالے سے بہت پریشان ہیں۔ وہ زمانہ اب جا چکا ہے جب لوگ بچت کے عادی تھے اور بچت کو سرمایہ کاری کے لیے بروئے کار لاتے تھے۔ اب اخراجات ہی اِتنے زیادہ ہیں کہ عام آدمی کے پاس کچھ بچ نہیں پاتا۔

ویسے تو خیر دنیا بھر میں معیشتیں شدید اُلجھن محسوس کر رہی ہیں مگر اس معاملے میں فرانس حیرت انگیز طور پر زیادہ خرابیوں کا شکار دکھائی دے رہا ہے۔ یورپی یونین میں کئی ممالک معاشی مشکلات سے لڑ رہے ہیں مگر فرانس کا معاملہ بہت ہی پریشان کن ہے۔ ۱۵ سال قبل فرانس بھی اُتنا ہی مقروض تھا جتنا اُس وقت جرمنی تھا مگر اب فرانس کا معاملہ بہت بگڑ چکا ہے۔ اِس وقت فرانس کے قومی قرضے اُس کی خام قومی پیداوار کے ۱۱۳ فیصد کے مساوی ہیں۔ فرانس کا سالانہ بجٹ خسارہ سرِ دست ۶ فیصد سے بھی زائد ہے۔ اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی معیشتوں کو بھی مشکلات کا سامنا ہے اور اُن کے لیے بھی بحالی کا عمل انتہائی دُشوار گزار ثابت ہو رہا ہے۔ کورونا کی وبا نے یورپ کو بھی بُری طرح متاثر کیا تھا۔ یورپ کے متاثر ہونے سے دوسرے خِطّوں کے وہ تمام ممالک بھی شدید متاثر ہوئے تھے جن کی یورپ سے تجارت غیر معمولی نوعیت کی ہے۔ سامان کی ترسیل کے رُک جانے سے یورپ کے بہت سے ممالک کو روز مرّہ استعمال کی بیشتر اشیا کی قلّت کے باعث شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ فرانس کا بھی یہی حال تھا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ فرانسیسی معیشت کے جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں، حقیقت اُن سے زیادہ خطرناک اور پریشان کُن ہے۔ جاپان کی طرح فرانس میں بھی پنشن کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ہر محکمہ اور ہر وزارت اِس حوالے سے مشکلات کا سامنا کر رہی ہے۔ انسٹیٹیوٹ دیز پالٹکس پبلکز کے بیان کے مطابق سالانہ ۱۸ ارب یورو سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کی مد میں دِکھائے جا رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ رقم پنشن کی مد میں دی جا رہی ہے۔ ایسی کیفیت معیشتی معاملات میں الجھاؤ پیدا کرتی ہے اور حکومتیں مشکلات میں گِھرتی چلی جاتی ہیں۔

فرانس میں سیاسی اُکھاڑ پچھاڑ بھی اب بہت بڑھ گئی ہے۔ بجٹ کو مضبوط بنانے کے حوالے سے سیاست دانوں میں اتفاقِ رائے کم ہے۔ اگر معاملات جلد درست نہ ہوئے تو فرانس میں حکومت ایک سال کے اندر گر بھی سکتی ہے۔

سیاسی محاذ آرائی بڑھنے سے معاشی معاملات بھی خرابی سے دوچار ہو رہے ہیں۔ اصلاحات کے لیے حمایت گھٹتی جا رہی ہے۔ معیشت میں پیدا ہونے والی خرابی کے نتیجے میں افراطِ زر کی سطح بلند ہو رہی ہے۔ سرکاری بونڈز پر سُود کی شرح کے حوالے سے بھی فرانس اور جرمنی میں اچھا خاصا فرق پایا جاتا ہے۔

یہ بات بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ یورپی یونین کے ممالک میں اگر کبھی بجٹ خسارہ کم تھا یا نہ ہونے کے برابر تھا تو اِس کا سبب یہ نہیں تھا کہ معیشتوں کی کارکردگی اچھی تھی یا سیاسی استحکام نے معاملات کو درست کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپی مرکزی بینک کی کارکردگی بہت اچھی تھی اور اُس نے یورپی یونین کے لیے برآمدات کی راہیں بہت حد تک وا کر دی تھیں۔ اس کے نتیجے میں یورپی یونین کے ہر ملک کی معیشت کو کُھل کر پنپنے کا موقع ملا۔

یورپی یونین سمیت پوری دنیا کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ہر طرح کے ممالک کے لیے معاشی مشکلات بڑھ رہی ہیں۔ عالمی منڈی راتوں رات اپنے رجحانات بدل لیتی ہے۔ برآمدی تجارت کو متوازن رکھنا انتہائی دُشوار ہو چکا ہے۔ عالمی تجارتی تنظیم کا نیٹ ورک اَب تک بھرپور کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکا ہے۔ عالمی تجارتی تنظیم کے ڈھانچے میں ایسی بنیادی تبدیلیاں متعارف کرانے کی ضرورت ہے جن کی مدد سے دنیا بھر کی معیشتوں کو پنپنے کا موقع ملے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ کسی ایک بڑی معیشت کے لڑکھڑانے سے دنیا بھر میں معاشی معاملات بگڑنے لگتے ہیں۔ ایسے میں معاشی معاملات کو درست کرنے کے اقدامات بہت سوچ سمجھ کر کرنا پڑتے ہیں کیونکہ کوئی ایک بڑی غلطی پوری دنیا کی معیشت کو داؤ پر لگا سکتی ہے۔

(مترجم: ابوصباحت)

"Budget deficits globally".
("The Globalist". September 5, 2025)